خالی پٹاریوں کا مداری

اقبال متین

نصرت پبلشرز۔ لکھنؤ ۳

خالی پٹاریوں کا مداری

(افسانے)

اقبال متین

نصرت پبلشرز۔ کپور مارکٹ اسٹریٹ۔ لکھنؤ۳

بار اوّل: دسمبر ۱۹۷۷ء

طباعت: نامی پریس۔ لکھنؤ

تعداد: ایک ہزار

اشاعت: نصرت پبلشرز۔ لکھنؤ۔۳

نشید
اور بچپن کی
یادوں کے نام

فہرست

پو پھٹنے تک

راملو کی چھوٹی سی کٹیا میں آٹھ زندگیاں سانس لیتی تھیں۔ اسی کٹیا میں انکیا کا بچپن جوانی سے جا ملا تھا۔ اسی کٹیا میں ملّیا کی مسیں بھیگی تھیں۔ اسی کٹیا میں پوچی نے شرمانا سیکھا تھا۔ اور پھر اسی کٹیا میں انکیا کی بیوی نے دو بچے بھی جنے تھے ـــ اور اب یہی بچے دن دن بھر کٹیا کے باہر ننگ دھڑنگ کھیلا کرتے تھے۔ راملو نے اسی کٹیا میں خوشیاں دیکھیں، غم سہے۔

دن تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا۔ رات کو راملو اپنی بوڑھی بیوی کے ساتھ ایک کونے میں پڑ رہتا۔ دوسرے کونے میں انکیا اور اس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ چمٹے رہتے۔ تیسرے کونے میں ملّیا اور پوچی اپنے سر جوڑ لیتے۔ پیٹھ کے بھائی بہن ہونے کی وجہ سے ملیا اور پوچی میں بہت پیار تھا۔ چوتھے کونے میں

جہاں چولہا تھا ایک دو مٹی کی ہانڈیاں پڑی رہتیں جہاں آس پاس کے مریل کتے موقع پاکر پہونچ جاتے۔

راملو کے آٹھ افراد پر مشتمل خاندان کو اس کٹیا سے کوئی شکایت نہ تھی اور اگر شکایت تھی تو اس میں کٹیا کا کیا دوش تھا، دوش تھا تو راملو کا اس کی بیوی کا جھنو نے ایک نہیں دو نہیں آٹھ بچوں کو اسی کٹیا میں جنم دیا تھا۔ وہ تو اللہ کی کرنی ایسی ہوئی کہ ہیضہ پھوٹ پڑا تو ایک ہی سال میں راملو کے پانچ بچے اسی کٹیا میں مرگئے تین بچ گئے تو راملو اور اس کی بیوی نے پیٹ کاٹ کاٹ کر ان کو پروان چڑھایا۔ انھیں اس قابل بنایا کہ اب وہ بھی اسی کٹیا میں بچے جن سکیں۔ ہیضے کی وبا نہ پھوٹتی اور راملو کے پانچ بچے نہ مرتے تو اسی کٹیا میں آج تیرہ زندگیاں سانس لیتیں یا سانس لینے کی خواہش میں سسکتی رہتیں۔ راملو کا دم گھٹ جاتا۔ وہ اپنی بیوی کو افیون کھلا کر اور خود کھا کر سو رہتا یا بوکھلا کر کسی گھنے درخت کے سائے میں پناہ لیتا یا نہیں معلوم اور کیا ہوتا۔ یہ بھی تو عین ممکن تھا کہ اتنے افراد اس کٹیا میں سانس لیتے تو ان کی سانسوں کی گرمی ہی سے اس کٹیا کو آگ لگ جاتی اور اگر آگ نہ لگتی تو چھپر اڑ جاتا راملو کے بھگوان کی کرپا تھی جو اس کے پانچ بچے ہیضے کا شکار ہو گئے اور آج راملو اپنے خاندان کے سات افراد کے ساتھ اس کٹیا میں سانس لینے کے لیے زندہ رہ گیا۔

انکیا کی بیوی آنے والی تھی، ساس سسر متفکر تھے کہ اس کٹیا میں کس طرح گذر بسر ہوگی لیکن انکیا کی بیوی آئی تو وہ یہ بھی نہ سوچ سکے کہ کس طرح گذر بسر کر رہی ہے اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اسی کٹیا میں دو بچے جن دیے۔ اب راملو اور اس کی بیوی کے بیٹے بیٹے اور بہو کا کٹیا میں رہن سہن کوئی مسئلہ ہی نہ رہا۔

لیکن آج راملو اور اس کی بیوی زیادہ پریشان تھے۔ ملّیا کی ننھی منی گھر والی پھوٹ پھاٹ کر اب جوان ہو گئی تھی۔ ملّیا ان تبدیلیوں سے واقف تھا اس لیے وہ اپنی جروا کو جلد ہی اپنے ساتھ لے آنا چاہتا تھا۔

پوچی نے اپنی ماں سے کئی بار کہا بھی تھا کہ ملّیا راتوں کو سوتا نہیں بلکہ آگ پر لوٹتا رہتا ہے، میں اس کے بستر پر آگ کی چنگاریاں ڈھونڈھتی ہوں، نوک دار کانٹے تلاش کرتی ہوں۔ لیکن کچھ بھی تو نہیں ملتا۔ یہ چنگاریاں، یہ کانٹے ملّیا کے جسم میں اندر ہی کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ تم رامی کو بلانے کے لیے کب جا رہی ہو ماں۔؟

راملو کی بیوی ٹکر ٹکر بیٹی کو دیکھتی رہ جاتی۔ اس کو سنائی دیتا جیسے پوچی کہہ رہی ہے کہ ملّیا کے ساتھ میں بھی تو آگ پر لوٹ رہی ہوں اور میرے بدن میں بھی سوئیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ لیکن راملو کی بیوی کے لیے فی الوقت پوچی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ راملو کو گھر لے آنا تھا تا کہ ملّیا آگ پر نہ لوٹے۔ اور پھر ملّیا نے ابھی اپنی بڑھی دبا رکھی تھی۔ وہ ایک بار بس یونہی کہہ دیا تھا کہ رامی کو اب لاتے ہی بنے گی۔

پچھلے روز جب وہ اس سے ملنے گیا تھا تو اس کی ساس اس کی بے اعتنائی کا شکوہ کر رہی تھی، بے رخی پر گالیاں دے رہی تھی۔ ملّیا کی ماں جانتی تھی کہ ملّیا اب زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرے گا۔ کوئی بات ہوتی تو پہلے پہل پوچی کے ذریعہ کانوں میں ڈلوا دیتا۔ شنوائی نہ ہوتی تو پھر خود ہی آندھی اور طوفان بن کر گرجنے لگا کرتا اور اسی لیے راملو اور اس کی بیوی آنے والی آندھی سے سہمے ہوئے تھے۔

آج بھی راملو کی بیوی نے ٹکر ٹکر بیٹی کو دیکھا تو اس نے کہا۔

"ماں پیپل تلے سو رہیں گے ہم"

راملو کی بیوی نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کر پیپل تلے کتنی راتیں کٹیں گی اور کس طرح کٹیں گی۔ وہ چپ چاپ راملو کے پاس چلی گئی جو کٹیا کی پچھلی باڑھ میں جگہ جگہ سے ہٹے ہوئے پورکوں کو ٹھیک سے جما رہا ہے۔

راملو نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے بے دلی سے اپنی بیوی سے کہا کہ پوچی کی ماں تو تو بالکل سٹھیا گئی ہے۔ بہو گھر کو آئے گی تو کیا ہم اپنی بیٹی کو بے آسرا کر دیں گے۔ پیپل تلے جوان بیٹی کو ساتھ لے کر کتنی راتیں باہر گزار سکیں گے اور پھر اب برسات بھی شروع ہونے والی ہے۔

لیکن پوچی کی ماں راملو کی ان باتوں سے مرعوب نہ ہوئی۔ وہ زیادہ تجربہ کار تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ کٹیا کے باہر رات گزارنی پڑے یا اندر، رامی کو بہرحال جتنا جلد ممکن ہو اپنے ساتھ لے آنا ہے، ورنہ ان کے پہل کرنے سے پہلے ہی رامی اس کٹیا میں آ براجے گی اور اس کے ہمراہ ملیا چھوٹی چھوٹی آندھیاں بھی لے آئے گا جو کٹیا کو ہلا دیں گی۔

رامی اپنے سسرال آ گئی تھی۔ بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ تاڑ اور کھجور کے پتوں کی فراہمی کے لیے راملو اور انکیا سرگرداں تھے۔ کٹیا کے اندر بچھے ہوئے بوسیدہ ٹاٹ اٹھا کر کٹیا کے چھپر پر اڑھا دیے گئے تھے کہ حتی المقدور ٹپکے سے محفوظ رہ سکیں۔ کٹیا کو وسیع کرنے یا ایک اور چھوٹی سی کٹیا بنا لینے کی حسرت راملو کے دل میں بہت دنوں سے تھی لیکن بارش کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ اپنی موجودہ کٹیا ہی پر کچھ خرچ کرنے کی گنجائش اپنے میں نہ پاتا تھا تو دوسری حسرتوں کا کیا ذکر۔

اپنے میکے سے آتے وقت رامی نے آدھی ہنڈی پرال کی گھاس ساتھ لے لی تھی جو پوری کٹیا میں بچھا دی گئی تھی تاکہ دیمک سے جہاں کپڑے اور بستر محفوظ ہو جائیں وہاں سیلی ہوئی زمین کی ٹھنڈک سے کٹیا میں رہنے والے خود کو بچا رکھیں۔ رامی کو اپنے سے زیادہ اپنی ساڑیوں کی چنتا تھی۔ پوچی اور انکیا کی بیوی کو اس قسم کی کوئی چنتا نہ تھی کیونکہ ان کے پاس جو ساڑیاں تھیں وہ ان کے بدن سے چمٹی ہوئی تھیں اور اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کے سبب انھیں دیمک کا ڈر رہتا۔ رامی کی بات جدا تھی۔ میکے سے وہ اپنی سسرال کو نئی نویلی آئی تھی اور اسی لیے اس کے پاس تین ساڑیاں بھی تھیں۔ شام کے وقت وہ سیوتی اور گڈیل کے پھول اپنے جوڑے میں سجا کر، ساڑی بدل کر خود کو کٹیا کی رانی محسوس کرتی اور ٹھمک ٹھمک کر اٹھلا اٹھلا کر وہ اپنی بقیہ دونوں ساڑیوں اور چولیوں کو کٹیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں لیے لیے پھرتی۔ اپنے ٹین کے صندوق کو سو سو جتن سے ادھر ادھر رکھتی پھرتی۔ جس میں اپنی ساڑیوں کے علاوہ اس نے ملّیا کا، ایک آدھ نیم آستین کرتہ، ایک آدھ پھٹی ہوئی دھوتی، اپنا تیل اور کنگھا بھی چھپا رکھا تھا۔۔۔۔ پوچی کو رامی کے بناؤ سنگھار سے خوشی نہ ہوتی تو غم بھی نہ ہوتا۔ لیکن انکیا کی بیوی رامی کو بناؤ سنگھار کیے دیکھتی تو اپنے بچوں کو چھوٹے چھوٹے قصور پر بھی مار پیٹ کرتی۔ ویسے رامی سے کبھی نہ الجھتی۔

دن دن بھر تو راملو اور اس کے دونوں لڑکوں کا وقت زیادہ تر باہر ہی گزرتا۔ اس کی بیوی بھی اپنی بڑی بہو کے ساتھ کچھ نہ کچھ محنت مزدوری کے لیے باہر چلی جاتی۔ کٹیا میں اکثر پوچی اور رامی ہی رہتیں۔ پہلے پہل تو انکیا کی بیوی کو اس

پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ رامی کیوں محنت مزدوری کے لیے باہر نہیں جاتی۔ لیکن
جوں جوں دن بڑھتے گئے اس نے دبے دبے احتجاج کیا اور جوں جوں دن بڑھتے
گئے رامی پرانی ہوتی گئی۔ اسی کٹیا میں نئی نویلی ہونے کے ناطے جو مراعات اس کو
حاصل تھیں وہ آہستہ آہستہ اس سے چھن گئیں۔

پھر گڈیل اور سیوتی کے پھولوں نے رامی کی زلفوں کی زینت بننے سے صرف
اس لیے گریز کیا کہ رامو کے خوشبودار تیل کی شیشی خالی ہو چکی تھی جس سے وہ اپنی زلفیں
سنوارتی اور گڈیل اور سیوتی کے پھول اپنے پودوں سے ٹوٹ کر اس کی زلفوں تک
پہنچ کر مسکراتے۔

اب رامی کو اس بات کی بھی فرصت نہ تھی کہ وہ اپنے ٹین کے صندوق
کو سو جتن سے ادھر ادھر کٹیا میں رکھتی پھرے جس میں اس کی ساریاں محفوظ تھیں۔
رامی وہی تھی، کٹیا وہی تھی، سب کچھ وہی تھا۔ لیکن چھوٹی بہو کی حیثیت
سے رامی نے اپنی ذمہ داریاں محسوس کرلی تھیں اور انکیا کی بیوی کے احتجاج
پر برا مانے بغیر اپنا بوجھ خود اٹھا لینے کے لیے کٹیا سے باہر اپنا قدم نکال لیا تھا اور
تیوری پہ بل ڈالے بغیر عملی طور پر زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔

شام ہوتے ہوتے سب کے سب تھکے ماندے اپنی کٹیا کو لوٹتے اور پھر
رات ہوتے کٹیا میں گرم گرم سانسوں کی حدت سے جیسے دھیمی دھیمی سی آگ
سلگنے لگتی۔

ایک رات طوفانی بارش تھی۔ سیلی ہوئی زمین، بھیگی ہوئی کچی دیواروں

اور چھپر کے درمیان، تیز تیز سانسوں کی گرمی اور حدت بھی جیسے ٹھٹھر رہی تھی۔ بوسیدہ کملوں اور چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے انسانی جسم ایک دوسرے میں اپنی حرارت منتقل کرکے سرد، ٹھنڈی اور یخ بستہ رات کو جھٹلانے کی ناکام کوشش میں اپنے گرم گرم جسم اور سانسوں کی حدت کے سہارے سیلی ہوئی زمین پر سکڑ رہے تھے۔ اور رات آہستہ آہستہ بڑی گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔

اور جب ڈھلے ہوئے صاف شفاف نکھرے ستھرے سورج نے اپنی کرنیں، اپنی روشنی، اپنی حدت، اپنی تمازت دنیا بھر میں تقسیم کی تو بوڑھا راملو اور اس کی بیوی سسکیاں لے رہے تھے۔ کیونکہ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے رات کے اندھیروں نے صبح ہونے ہوتے کٹیا کی عزت اور آبرو کو چبا کر جیسے تھوک ڈالا تھا۔

انکیا رات ہی سے کہیں غائب تھا۔ جاتے وقت وہ بڑبڑا رہا تھا کہ ہم بے قصور ہیں۔ نردوش ہیں۔ لیکن اس زندگی سے موت بھلی ہے۔ ملّیا کے مزاج کی تندی نے غصے اور نفرت کی آگ کٹیا بھر میں لگا دی تھی۔ بھیگی ہوئی کٹیا سورج کی کرنوں میں اس طرح نہا رہی تھی جیسے اندھیرے اور اجالے سب اس کے لیے یکساں ہوں۔

لیکن کنواری پوچی کو معلوم ہو چکا تھا کہ رات کو اس کی بھابیاں بدل گئی تھیں..... وہ رات کو جن کے ساتھ سوئی تھیں وہ ان کے اپنے شوہر نہ تھے۔

بہروپ

"دشمنوں کا مزاج ٹھیک نہیں ہے۔ آرام بی بی"
"آئینہ بھی دیکھا ہے کبھی؟ چہرہ کتنا اتر گیا ہے بٹیا"
"بی بی آج پھر نظر لگ رہی ہے۔ نمک کی دو کنکریاں اتار دوں تب باہر جانا"
"اس طرح کام چلنے سے رہا۔ دو لقمے کھا کر ہی کہیں آدمی زندہ رہے ہے بھلا"
"یہ اس طرح بندی کیوں لگاتی ہو۔ یہ بندیا تو غضب ڈھاتی ہے بی بی"
"تین بچوں کی ماں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کل بیاہی گئی ہو"
"لو چلتی ہوں۔ اب میاں جی آ رہے ہیں"
میری بیوی اس کی ہمدردی کی اور محبت کی بے پناہ قائل تھی۔ جب تک وہ بیٹھی رہتی۔ بس اسی کی باتیں کیے جاتی۔ صحت کا خیال رکھنے کے لیے قسمیں دیتی۔

ذرا سا تیز چلنے پر ٹوکتی۔ کام زیادہ کرنے سے منع کرتی۔ میری بیوی ذرا سا مضمحل اور اداس ہوتی تو یہ دوہرے تن و توش کی عورت اسے سو سو طرح رجھاتی اس کا دل بہلاتی۔ اس کو ہنساتی۔

آفس سے لوٹنے میں مجھے دیر ہو جاتی تو وہ میری بیوی کی تنہائی میں رفیق بن جاتی۔ دنیا بھر کے قصّے لے بیٹھتی۔ پھر بات کرتے کرتے ہر بات کا رُخ لمحے بھر کے لیے میری بیوی کی جانب پھیر دیتی۔ اس کے اخلاق کی، اس کی مروت کی، دو لفظوں میں اس طرح تعریف کر دیتی جیسے قصداً اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ کسی اندرونی جذبے نے اسے اس قسم کی بات کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"غریبوں کے لیے جو لگن تمہارے دل میں ہے بی بی، مجھ نصیبوں جلی نے کسی میں نہیں دیکھی۔"

یہ جملہ بالکل غیر مربوط طور پر اس قصّے سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی جو وہ ابھی ابھی بیان کر رہی تھی اس کی زبان سے اس طرح ادا ہو جاتا جیسے کسی خاص جذبے نے کہلوا دیا ہو۔

پھر بات کا تسلسل قائم ہو جاتا۔ اڑوس پڑوس کی باتیں ہوتیں۔

"فاطمہ اپنے بڑے سے گھر میں مجھے تو ایک بھٹکتی ہوئی روح معلوم ہوتی ہے بی بی، بالکل بے زبان گائے کی طرح ہے یہ لڑکی، تنہا تنہا، چپ چپ، در و دیوار کو تکے جاتی ہے۔ بہت دل اچاٹ ہوا تو پیچھے پائیں آئی اور گز بھر کا گھونگٹ کاڑھے میٹ میٹ پلکیں جھپکانے لگی۔ ہوا سے جھومتے ہوئے درختوں کو، اسکول کی طرف بھاگتے ہوئے بچوں کو، سڑک پر دوڑتی ہوئی موٹروں اور سائیکلوں کو وہ سب خالی

خولی آنکھوں سے صرف دیکھے جاتی ہے۔ جیسے ان جھاڑیوں میں' ان بچوں میں'
ان موٹروں میں کچھ فرق ہی نہیں۔"

"میں تو بس تم دونوں میاں بیوی پر پہلی نظر ہی میں ریجھ گئی بٹیا۔ کتنی محبت'
کتنا پیار' اس طرح جیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ لیکن سچ پوچھو
تو تمہارا کمال ہے بی بی۔ اپنے اوصاف سے اپنا لیا سو اپنا لیا۔ ایک بار جو تمہارا ہوا سو
ہو گیا عمر بھر کے لیے۔"

"یہ ایرانی لوگ دھندے میں لگتے ہیں تو دنیا کو بھول جاتے ہیں۔ فاطمہ کا شوہر
سنتی ہوں ویسے نیک آدمی ہیں۔ لیکن اتنے بڑے ہوٹل کا دھندا ہے۔ سنا ہے بچے
بچر سے سب الگ کر کے اب وہ تنہا مالک ہو گیا ہے۔ فرصت ہی نہیں ملتی غریب کو۔
رات گئے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک آتا ہے اور پڑ رہتا ہے۔ پو پھٹی نہیں کہ
اندھیروں کی طرح غائب ہوا۔ وہ بھٹکتی رہتی ہے بے زبان روح کی طرح ایسی دولت
بھی کس کام کی بٹیا کہ میاں بیوی کا ہے' نہ بیوی میاں کی۔"

"دیکھو دیکھو اس طرح رپ جھپ کہاں چلیں' کتنی بار سمجھایا ہے کہ ایسے دنوں
میں اس طرح تیز تیز نہیں چلتے۔ خدا نہ کرے کچھ ہو ہوا گیا تو خود تکلیف اٹھاؤ گی' میاں
کو پریشان کرو گی۔"

مسکرا کر بڑے پیار سے دیکھا۔ پھر کہنے لگیں "تمہیں مزا بھی تو ملتا ہے نا میاں
جی کو پریشان کرنے میں۔"

"اسے میں چائے پی آئی ہوں بی بی۔ میرے لیے اتنی تکلیف نہ کیا کرو۔"
"سنا بھی ہے کچھ' یہ جو پڑوس میں چوری ہوئی ہے نا۔ کس کے طفیل لٹ

گیا بسا بسایا گھر، میں تو کہتی ہوں کہ میاں جی کو جتا دو کہ کچھ دن سر شام ہی آجایا کریں۔ یہ جو عزیز میاں کے گھر سے لگا بگا ایک حجرہ سا ہے نا۔ وہاں پولیس کا ایک انسپکٹر رہتا ہے۔ بس اسی کے چھوٹے بھائی کے ہیں سب کرتوت۔ چھوٹا بھائی راتوں کو چوری کرتا ہے اور بڑا بھائی دن کو پردہ پوشی۔ لو جی کوتوال شہر خود راہزن ہو تو چل چکی حکومت نگوڑی۔"

"اے ہے۔ میں کہتی ہوں۔ لو پسینہ خشک کر لو۔"
"میری سنو تو ذرا کمر سیدھی کر لو۔ میں پیر داب دوں۔ میری بچی جیسی تو ہو ہی۔"
"لو میں چلی میاں آرہے ہیں۔"
اور وہ چلی جاتی۔
پھر آہستہ آہستہ تکلفات ختم ہوئے۔ میاں جی آرہے ہوں۔ تب بھی بیٹھی رہتیں۔ دو ایک باتیں اب وہ مجھ سے بھی کرنے لگیں۔ لیکن بیوی کی بات کچھ اور تھی۔ مجھ سے ان کی صاحب سلامت ہی تک رہی۔ اور پھر اکثر یہی ہوتا "لو میں چلی میاں جی آرہے ہیں۔"

میری بیوی کے ساتھ بڑی ماں کا پیار محبت۔ اپنے دل میں بڑی ماں کے لیے جگہ بنانے لگا۔ "بی بی" کا تو یہ عالم تھا کہ بعض وقت ایسے میں یہ تذکرے مجھتیں کہ مجھے قطعی ناگوار گزرتا۔

بات ہو رہی ہے کہ بھٹی گرین اسٹور کے سیٹھ نے پیسوں کے لیے یاددہانی کی ہے۔ وہ ملا کفارا سنتے ہیں۔ جواب ملتا ہے۔ بڑی ماں آئی تھیں۔ یہ پھول میرے بالوں میں لگا گئی ہیں۔ دعائیں دیں۔ سوا لگ نمک کی کنکریاں اتاریں سو۔

لیجئے اب گرین اسٹور کے سیٹھ ملیں یا خود گرین اسٹور ہر راستے پر ملتا رہے۔ یہاں تو بڑی ماں پھول لگا گئیں اور دعائیں دیں سو الگ۔ یہی ساری دعائیں آپ بھی گرین اسٹور کے سیٹھ تک پہنچا آیئے۔

"چار دن سے دفتر میں اس قدر کام بڑھ گیا ہے۔ نیا سال جو — سُن بھی رہی ہو کچھ —؟"

"بڑی ماں نے آج تو کمال ہی کر دیا۔"

"لیجئے۔"

اب دفتر ساتھ لے جا کر بڑی ماں سے ان کا کمال دیکھتے رہیئے۔ یا فائلوں کو آگ لگا کر بڑی ماں سے کہیئے کہ وہ دعاؤں کی بارش کریں۔

ایک دن میری بیوی کہنے لگی بڑی ماں آج بہت اداس تھی۔ ان کی اپنی بیٹی اور داماد میں کچھ اَن بَن ہو گئی ہے۔ مجھے بھی کچھ فرصت تھی۔ میں نے بھی بڑی ماں کی باتیں سن لینے میں مضائقہ نہ سمجھا۔ ویسے میں خود بھی تو ان کا مخالف نہ تھا۔ میری بیوی کا وہ اتنا خیال رکھتی تھیں تو میں بھی انھیں کچھ پسند ہی کرنے لگا تھا مجھے اپنی بیوی سے شکایت تھی تو صرف اتنی ہی کہ بعض وقت وہ بے موقع بڑی ماں کی باتیں لے بیٹھتیں۔

پھر ایک دن مجھے اپنی بیوی سے معلوم ہوا کہ بڑی ماں کی دختر نیک اختر بھی آئی ہوئی ہیں۔ پھر وہ بڑی ماں کے ساتھ اکثر میرے گھر آنے لگیں۔ میری بیوی کو انھوں نے بھی اپنی ماں کی طرح رچھایا اور اپنا لیا۔

ایک روز میں گھر پر تنہا تھا۔ ہماری زندگی میں ایک اور پھول کھلنے والا تھا۔

ایک اور زندگی کا اضافہ ہونے والا تھا۔ بیوی کو آج ہی میں نے ہاسپٹل میں داخل کرایا تھا۔

بڑی ماں اپنی بیٹی کے ساتھ بڑے اطمینان سے میرے گھر چلی آئیں، پھر میرے کمرے کی طرف بڑھیں میں نیم دراز سا اپنے پلنگ پر پڑا ہوا کچھ اپنی بیوی اور آنے والے نئے مہمان ہی سے متعلق سوچ رہا تھا۔

بڑی ماں کہنے لگیں "میاں جی اکیلے کیا کر رہے ہو۔ بٹیا نہیں ہے تو دل کہاں لگ رہا ہوگا تمہارا۔ میں نے سوچا جمیلہ ہی کو تمہارے پاس چھوڑ آؤں۔ ہم عمر ہو۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرو تو دل بہل جائے گا" پھر کہنے لگیں "ہاں میاں بٹیا کو ملنے کو بہت چاہے ہے جی! بھلا اوقات کیا ہیں ہسپتال کے۔ میں مل آؤں ذرا کی ذرا"

جمیلہ کھڑی مسکرا مسکرا کر مجھ پر کومل کومل سی کرنیں پھینک رہی تھی۔
ان کرنوں کے تانے بانے سے میں ابھی بچ ہی رہا تھا کہ بڑی ماں نے آخری پانسہ پھینکا۔

"بھئی میں تو چلی۔ اب تم جوانوں میں مجھ بڑھیا کا کیا کام؟" میرا دماغ ماؤف سا ہو گیا۔ میرے کان بجنے لگے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری بیوی کہہ رہی ہے۔ بڑی ماں بہت اچھی ہیں۔ بڑی محبت سے مجھے زہر ملایا اور پھر زہر بھی کچھ اتنا تلخ نہیں تھا۔ بڑا میٹھا میٹھا سا۔ ایسا کہ آدمی چسکیاں لیتا رہے اور زندگی سے دور ہوتا رہے ——— میں کچھ دیر نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر بے تحاشا بڑی ماں کے پیچھے بھاگا ——— "بڑی ماں سنیئے تو" لیکن وہ ہماری کالونی کے گیٹ تک پہنچ

گئی تھیں۔ اور کسی سے اشاروں میں کچھ کہہ رہی تھیں ۔ کوئی شخص تحرڈ پر گیٹ کے پیچھے خود کو چھپا رہا تھا۔ شاید وہ ہمارے پڑوسی پولیس انسپکٹر کا وہی بھائی تھا جس کے متعلق شہرت تھی کہ اڑوس پڑوس میں ہاتھ کی صفائی بتاتا پھرتا ہے ۔میں لوٹنے لگا تو جمیلہ چھجے پر کھڑے ہوئے ایرانی سیٹھ پر مسکراہٹوں کی کرنیں پھینک رہی تھی۔ وہ بھی اشاروں ہی اشاروں میں بوس وکنار کی منزلیں طے کر رہا تھا۔۔ ایرانی سیٹھ کی بیوی فاطمہ اپنے لمبے سے گھونگٹ میں دنیا بھر کی شرم وحیا سمیٹے چھجے پر نکل آئی۔ تو ایرانی نے جمیلہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ فاطمہ تو بقول بڑی اماں کے ہوا سے جھومتے ہوئے درختوں کو، اسکول کی طرف بھاگتے ہوئے بچّوں کو سڑک پر دوڑتی ہوئی موٹروں اور سائیکلوں کو خالی خولی آنکھوں سے دیکھے جاتی ہے جیسے ان جھاڑوں میں۔ ان بچّوں میں۔ ان موٹروں میں کچھ فرق ہی نہیں ۔۔" اے میاں پکار رہے ہو!" میں نے پلٹ کر دیکھا تو بڑی ماں کھڑی تھیں۔

میں نے اپنا رُخ ان کی طرف کر لیا۔ لیکن وہ ہوا سے جھومتا ہوا درخت، سڑک پر دوڑتا ہوا موٹر، اسکول کی طرف بھاگتا ہوا بچّہ سبھی کچھ نظر آرہی تھیں۔

اور میں بغیر کسی گھونگٹ کے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بھری پوری دنیا میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

تنگی زخم

مہینے کی پہلی تاریخ کا تصوّر کسی کے لیے خوش آیند ہوتا ہو تو ہو، میرے لیے تو سارے سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ غلّہ والا۔ دودھ والا۔ مالک مکان۔ ملازم۔ دھوبی۔ بھنگی۔ نائی۔ بچّوں کی فیس۔

پہلی تاریخ چپکے سے اس طرح نہیں چلی آتی جس طرح ولی دکنی کی محبوبہ دلنوازان کے گھر آتی تھی ؎

ولی اس گوہر کانِ وفا کا واہ کیا کہنا
مرے گھر اس طرح آدے ہے جوں سینے میں راز آئے

پہلی تاریخ تو اپنے جلو میں بڑی ہنگامہ آرائیاں، بڑی حشر سامانیاں لیے بالکل مخدوم محی الدین کی مرضی کے مطابق کچھ اس طرح آتی ہے ؎

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

لیکن آنے والی پہلی تاریخ تو خاص طور پر میرے لیے مصائب کا ایک پہاڑ لے کر کھڑی تھی۔ اس پہاڑ کی چڑھائی ہلاری اور تین سنگھ کے کارناموں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ جنھوں نے ایورسٹ کو فتح کر لیا تھا۔

ایورسٹ کے فاتح تو زندگی میں ایک بار ایورسٹ کو زیر کر کے امر ہو گئے۔ یہاں یہ عالم تھا کہ جسم وجاں کی ساری قوتیں اور دل و دماغ کی ساری توانائیاں صرف کر کے اگر میں آنے والے مہینے پر فتح پا لیتا تو بھی کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ میری طرح کتنے ہی ایسے فاتح ہوں گے جو ایک ایورسٹ پر چڑھ کر دوسرے ایورسٹ کا بوجھ پہلے سے اپنے سینے پر رکھ لیتے ہیں۔ لیکن تاریخ کے جن صفحات میں ان کے نام محفوظ ہیں، ان صفحات کو عرف عام میں دفتر کے رجسٹر یا قبر کے کتبے کہا جاتا ہے جنھیں کوئی تاریخ کا طالب علم دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ صفحات اس کے نصاب کی کتابوں سے خارج کر دیے گئے ہیں یا پھر شامل ہی نہیں کیے گئے۔

میں اسی پہاڑ کی بلندیوں تک پہنچنے کی انتھک کوشش میں یخ بستہ ماحول کے درمیان کھڑا ہانپ رہا تھا کہ مجھے ایک ہلاری مل گیا میرے اس ہلاری کا نام تھا جتیندر۔

جتیندر میرے آفس کے ساتھیوں میں سب سے کم عمر تھا اس کی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ عمر کی اس منزل پر تھا جہاں عورت اپنے حسن اور رعنائی سے قطع نظر کر کے بھی صرف عورت ہونے کے ناتے خیال و خواب کا ایک جہان بن جاتی ہے۔ ایک

کائنات بن جاتی ہے ـــــ اور جتیندر اسی کائنات میں لمبی لمبی گہری سانسیں کھینچ کر
کسی بھی عورت کی اس تازگی کو اپنے میں حلول کر لینا چاہتا تھا جو اس کی نس نس سے
کنوارپن کے پھیلائے ہوئے زہر کو نچوڑ سکے۔

عورت تک پہنچنے میں اس کے راستے کی رکاوٹ وہ بندھن تھے جو بیاہ
میری اپنی بیوی اور میرے اپنے بچوں کے درمیان حائل ہو گئے تھے کسی بھی مہینے
کی پہلی تاریخ اس کے لیے بھی کبھی سوغات لے کر نہ آتی تھی جو بندھن میرا پیٹ
مقدر بن گئے تھے۔

اس کی محرومی سچ پوچھیے تو اس کی بیمار بہن تھی جو عمر میں اس سے بڑی تھی۔
لیکن اس کے باوجود جتیندر کی بیوہ ماں اپنی اکلوتی بیٹی کی سیج سنوارنا چاہتی تھی جو
کچی کلیوں اور ادھ کھلے پھولوں سے کسی بھی پھول والے کے یہاں سے خریدی جا سکتی تھی۔
لیکن جتیندر کی بہن اس سیج کے لائق اس لیے نہ تھی کہ اس کا بدن جیسے پھولوں کی تند
خوشبو کا متحمل ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی سانسوں سے دنیا بھر کی دواؤں کی بو آتی
تھی اور اسی سے بچنے کے لیے جتیندر نے اپنے خیالوں کی دنیا کو عورت کے حسین و دلچسپ
تصور سے معطر کر رکھا تھا۔ ویسے بقول اس کے وہ مقبول گھرانے کا ایک چشم و چراغ
تھا جس کی بالی گھی میں ڈبو کر جلائی گئی تھی۔

اس کی ہمدردیوں نے جب زخموں پر تیلیوں کے بجائے مرہم کے بھگو
بھگو کر رکھے تو میں نے بڑی فراخ دلی اور بلند حوصلگی کے ساتھ اپنا سینہ کھول کر سارے
کے سارے جگمگاتے زخم اس کے سامنے پھیلا دیے۔
اس وقت میرے زخموں کی ساری جگمگاہٹ اس کی آنکھوں میں گرا کر

بن کر ٹوٹتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں کسی نمی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اس کے چہرے پر دور دور تک کسی غم کی پرچھائیں نہ تھی اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچ رہی تھیں، اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔

مجھے سخت ذہنی اذیت پہنچی تھی میرے ہرے ہرے ننگے زخموں کو اپنی آنکھوں میں کرنوں کی طرح ناچتی ہوئی سوئیوں سے اس نے چھید کر رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے کی دمک تمازت اور گرمی پہنچانے کے بجائے میرے زخموں پر برف کی قاشیں رکھ رہی تھی۔

آخر وہ میری زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی مجبوریوں ان ننھے ننھے سانحوں کی داستان سن کر اتنا خوش کیوں ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے بہت جلد اپنی خوشی پر قابو پا لیا۔ پھر بھی اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ کسی ڈھکی چھپی مسرت کی غمازی کر رہا تھا۔

"تم بالکل فکر نہ کرو" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرنے ہی سے تو فکر دور نہیں ہو جاتی" میں نے اس طرح کہا جیسے میں نہیں بول رہا ہوں۔ میرے زخموں کو زبان مل گئی ہے۔

"بس کل صبح چلے آنا میرے گھر۔ ساہو سے دلا دوں گا۔ سود بھی زیادہ نہ ہو گا"

"تم سانڈ کی طرح پڑے سوتے رہو گے۔ تمھیں دنیا کے دکھ درد کا علم ہی کیا ہے" میں نے بات پکی کرنے کے لیے اضافہ کیا۔

"میں بہت جلد بیدار ہو جاتا ہوں" اس نے پھر اپنی خوشی کو دبانے کی کوشش کی۔"

"بہت خوش نظر آتے ہیں" میں پوچھ ہی بیٹھا۔
"پھر کیا خوش نہیں ہوں گا۔ تم جیسے دوست کے کام آسکوں تو یہ مری خوش نصیبی نہیں ہے؟"
"اچھا تو یہ بات ہے" واقعی اس کے اس جذبے نے مجھے بے اندازہ تسکین دی۔"
"ہاں ذرا کپڑے بڑھیا پہن کر آنا۔ وہ سوٹ ہے نا تمہارا وہی ڈاٹ لینا۔"
"بھئی سوٹ ہی پہن لوں گا۔ لیکن اس طرح بنا سنوار کر کہاں لے جاؤ گے مجھے"
"اسی ساہو کے بچے کے پاس۔ اس پر رعب جو جمانا ہے!"
مجھے ہنسی آگئی — وہ خود بھی ہنستا رہا۔
میں نے کہا یار "ایسے کتنے ہی جھوٹے رعب جمانے والے اس کے پاس دن میں چکر لگا جاتے ہوں گے"
"کچھ بھی ہو پیارے۔ خوش پوشی ہمیشہ آنکھوں میں دھول جھونکتی ہے۔ لوگ آنکھیں ملتے جاتے ہیں اور دھوکہ کھا جاتے ہیں"
"اچھا بھئی یہی سہی"
میں اطمینان سے گھر لوٹا۔ عبید نے واقعی دوستی کا حق ادا کیا تھا۔ ورنہ نفسی نفسی کے اس زمانہ میں کون کسی کے دل تک پہنچتا ہے۔ ایورسٹ کی فتح اب میرے لیے کوئی کارنامہ نہیں رہی تھی۔ کل صبح ہونے تک میں ایورسٹ کی چوٹی کو اپنے کفِ پا کے لمس سے آشنا کر دوں گا۔ دنیا بھر کی زبان پر میرا نام ہوگا کہ نہیں

اس سے مجھے دلچسپی نہیں۔ میری بیوی اور میرے بچّوں کی زبان پر میرا ہی کلمہ ہوگا۔
صبح ہوتے ہوتے میں دھڑکتے دل سے جتیندر کے دروازے پر وقت سے کچھ پہلے ہی کھڑا تھا۔ کواڑ کھٹکھٹائے تو ایک بڑھیا نے دروازہ کھول کر میرا سواگت کیا۔ مجھے بڑے ادب سے لے جا کر ڈرائنگ روم میں صوفے پر بٹھایا اور خود اطلاع دینے چلی گئی۔

میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا بیٹھا جتیندر کے تئیں کے متعلق سوچتا رہا اس کے جملے رہ رہ کر میرے کانوں میں گونجتے رہے کہ یار میرے ہزاروں روپے جو مجھے ترکے میں ملے ہیں۔ بنک میں پڑے ہیں لیکن میں اپنی ماں سے اجازت لیے بغیر ایک پیسہ بھی نکال نہیں سکتا۔ دنیا ملتی ہے یار۔ ماں کہاں ملتی ہے ماں کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت ہے۔"

جتیندر کتنا ہمدرد دوست، کتنا فرماں بردار بیٹا اور کتنا ذمہ دار بھائی تھا۔ اس کی شخصیت کی تہہ داری آہستہ آہستہ مجھے متاثر کرنے لگی۔ میں انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ یکایک ایک دیدہ رو اور باوضع بزرگ کمرے میں داخل ہوئے میں تعظیم کو اٹھ کھڑا ہوا۔ جب انھیں میں نے بتایا کہ میں جتیندر کے لیے آیا ہوں تو وہ کچھ اس نگاہ سے مجھے دیکھ کر لوٹ گئے جیسے میں نے کوئی قصور کیا ہے۔
جتیندر آیا تو میں نے پہلا سوال یہی کیا کہ یہ بزرگ کون ہیں۔ جتیندر نے بتایا کہ وہ اس کے دور کے رشتوں کے چچا ہوتے ہیں۔
بات آئی گئی ہوگئی اور ہم دونوں ایورسٹ کی فتح کے لیے روانہ ہو گئے۔
ساہو کے گھر کے قریب پہنچے تو جتیندر نے پوچھا "تمہیں صرف سو روپے چاہئیں نا؟"

میں نے کہا "ہاں! میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔"

جتیندر کچھ خاموش سا میرے ساتھ چلتا رہا۔ میں نے خاموشی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ وہ مجھے ساہوکار سے اپنے افسر کی حیثیت سے ملائے گا اور میں بھی اپنی عہدہ کو ملحوظ رکھوں۔

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے جتیندر کو بھی ہنسانے کے لیے وہ سارے جملے اس کے آگے دہرائے جو ہم اپنے افسروں کی نقل اتارنے کے لیے اپنے ساتھیوں میں دہراتے تھے اور جتیندر اس قدر محظوظ ہوتا تھا کہ اس کی ہنسی قہقہوں کی حدوں کو چھو لیتی تھی۔

لیکن اس وقت وہ بدقت تمام مسکرا سکا۔

ساہو کی سیڑھیاں چڑھتے وقت اس نے مجھ سے کہا۔

"یار تم دو سو کا کاغذ لکھ دو نا۔ سو روپے کی مجھے بھی ضرورت ہے اپنے حصّہ کا سود میں ادا کرلوں گا۔ دفتر میں پہلی بار میرے زخموں کے عریاں ہو جانے پر جتیندر کی مسرّت کا عالم میری آنکھوں کے سامنے مجسّم ہو کر رہ گیا تھا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اور جتیندر جس پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں وہ ایورسٹ سے کئی ہزار فیٹ بلند ہے اور ہلاری اور تینزنگ ہزاروں فٹ نیچے کسی گہری اور عمیق کھائی میں کھڑے چلا رہے ہیں۔ تم اور جتیندر عظیم ہو۔ تم اور جتیندر امر ہو ــــ اور اس کھائی کا نام ایورسٹ ہے۔

قرض لے کر میں اور جتیندر لوٹ رہے تھے تو میں اخلاقاً اس کو چھوڑنے کے لیے رکشا پر اس کے ہمراہ اس کے گھر گیا۔

دروازے پر پہنچا تو ان اجنبی بزرگ کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی جن سے ڈرائنگ روم میں صبح مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔

وہ کہہ رہے تھے "اب تو تیرا لونڈا ابھی میرے ڈرائنگ روم میں اپنے دوستوں سے ملنے لگا ہے۔"

اور وہی بڑھیا سامنے کھڑی تھی جس نے صبح کو میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔
میں آپ کو کس طرح بتا دوں کہ وہ غضنفر کی ماں تھی جبکہ غضنفر نے مجھے یہ نہیں بتایا۔

— —

شرمیلا

بیوی بناؤں گا تو اسی کو ورنہ پھر عمر بھر کنوارا ہی رہوں گا۔"

ایسی کوئی بات واجد میاں نے اپنے ماں باپ سے نہیں کہی۔ بس شرمائے جاتے اور کسی کو چاہے جاتے۔ بتی جلتی ہے تو اطراف میں اجالے بھی پھیلتی ہے لیکن واجد میاں جس کے لیے جل رہے تھے اس کے حصے میں بھی روشنی کی ایک کرن تک نہ آئی تھی جو وہ ایثار اسے نہ پا سکتی۔ وہ بے چاری بھی گھور اندھیروں میں بھٹکتی رہ گئی جہاں ذرا سی جگنو کی چمک نظر آئی اور دوڑی پیچھے۔ ایسے میں بھلا کیا ہاتھ لگ سکتا تھا اور اگر جگنو ہی ہاتھ لگ جاتا تو وہ بھی ایسا کیا ہو جاتا۔ یہی نا کہ وہ چمک بھی مٹ جاتی جو اندھیروں کا احساس بڑھا دیتی ہے۔

اب طاہرہ کے لیے واجد میاں سناٹے میں پٹتا ہوا تاشہ نہ رہے تھے، اب

تو صرف سناٹے رہ گئے تھے۔ اور بس ــــ خاندان بھر میں باتیں ہوئیں۔ گھر گھر میں چرچا ہوا۔ جس کسی نے سنا واجد میاں کی تعریف کی۔ بھوری بیگم کی قسمت کو سراہا۔
" انھیں تو آنکھ بند کر کے اپنی لاڈلی کا ہاتھ واجد میاں کے ہاتھ میں تھما دینا چاہیے۔ کون سے ہیرے جڑے ہیں۔ طاہرہ میں۔ پھر لڑکا کیا واجد میاں جیسا کمائی پوت جو دریا کے سینے سے سیپ نکال لائے اور سیپ کے سینے سے موتی "
اور جب تک واجد میاں دامادی کی امید میں بھوری بیگم کے گھر کا طواف کرتے رہے۔

بھوری بیگم کے دن اچھے ہی گزرے۔ اچھا کھاتیں، اچھا پہنتیں اور طاہرہ کو تو جیسے کسی چیز کی کمی ہی نہ تھی۔

ویسے بھی بھوری بیگم مزاج کی بڑی نرم تھیں۔ واجد میاں پسند نہ بھی ہوتے تو طاہرہ کی خاطر وہ سب کچھ سہہ لیتیں، لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ واجد میاں صرف بھوری بیگم کو پسند تھے۔ بلکہ سارے خاندان کے ایک ایک فرد نے ان کی طرفداری میں اپنا ووٹ دے دیا تھا۔ اور بات بالکل طے تھی کہ بھوری کو بڑا اچھا داماد مل رہا ہے جو پتھر کا کلیجہ چیر کر لعل نکال لاتا ہے اور اسی لعل کی روشنی سے بھوری کا گھر منور رہے۔

واجد میاں یوں بھی بھوری بیگم کے لیے غیر تو تھے نہیں۔ انھیں کے دیور کے لڑکے تھے۔ اور شہر بھر میں بھوری بیگم کے دیور کا کاروبار بڑے ٹھسے سے چل رہا تھا۔ بس کھڑے کھڑے ہزاروں کی کوٹھیاں، مکانات، باغات، زمینیں نیلام کروا دیتے تھے۔ کمیشن ملتا سو الگ، ساز باز ہوتی سو جدا۔ دولت بٹوری سو الگ، نام

کمایا سو جدا۔ اور ایسے دیور کے واجد میاں اکلوتے بیٹے تھے۔ اس طرح یہ گھر بھی واجد میاں ہی کا گھر تھا۔ لیکن بات دراصل یہ تھی کہ دونوں گھروں کے آپس میں تعلقات کچھ کشیدہ سے تھے۔ خون کا رشتہ عدالت کی دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہو تو ہوتا ہو، دل کی نگری میں تو بس پیار کا جادو چلتا ہے۔ بھائی بھائی سے ملتا رہتا، لیکن واجد میاں اپنی جنتِ غم سے برملا تھے۔ اب ان کے پاس تو دونوں نعمتیں تھیں۔ خون کا رشتہ بھی، پیار کا جادو بھی۔ لیکن ان کی ماں اس پیار کی لہلہاتی کھیتی پر ٹڈی دل کی طرح کسی وقت بھی یلغار کر سکتی تھی۔ اور یہی وسوسہ واجد میاں کی مسکراہٹوں پر پہرے بٹھائے رکھتا۔

یہی خوف کبھوری بیگم کو بھی کھل کر ہنسنے سے روکتا رہتا۔

لیکن خاندان کی وہ عورتیں جنھیں واجد میاں کی خوشنودی منظور رہتی، کچھ اس قسم کی باتیں کرتیں۔

"اوئی جب دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

وہ عورتیں جنھیں کبھوری بیگم سے قریب خاطر تھا انھیں بھی تسلی دیتیں۔

"ہاں بہن بڑا نیک لڑکا ہے۔"

"لیکن ماں کے آگے لب سل جاتے ہیں اس کے۔" کبھوری بیگم اتنے دکھ سے کہتیں جیسے اس کی نیکی کا ماتم کر رہی ہوں اور بعض اوقات واقعی ان کی آنکھیں چھلک جاتیں۔

"چلو جی تم تو کمال کرتی ہو کبھوری ۔۔۔ واجد بچہ تو ہے نہیں جو اپنا برا بھلا نہ سمجھتا ہو ۔۔۔ ظلم حد سے سوا ہوتا ہے تو مرتا کیا نہیں کرتا۔"

"ماں، ماں نہ ہو گی تو اولاد، اولاد دکھوں ہو نے چلی" ۔۔ بھوری بیگم کی ہمدرد عورتیں تسلیاں دیتیں۔

واجد میاں اپنی چچی کے گھر دتّو میاں پکارے جانے لگے۔ سبھوں نے انھیں اپنایا اور ان کی منزلت کی۔ خود دتّو میاں میں چاہے جانے کے بڑے ڈھنگ تھے۔ خاندان بھر کو اپنا لینے کا ایک ایسا طریقہ انھوں نے ایجاد کیا تھا جو آج تک ان کے اجداد میں کسی کے بس کا روگ نہ ہوا۔ واقعی دتّو میاں کا اعجاز تھا۔ عقلیں حیران رہ جاتی تھیں۔ زبانیں گنگ، لوگ ٹکر ٹکر منہ تکتے رہ جاتے اور واجد میاں پھولے نہ سماتے۔

"بھئی ایف۔ ڈی خان کے پاس سے ہم نے کنٹرول ریٹ پر دو روپے پونے چھ آنے گز سے یہ کپڑا خریدا تھا۔"

"دجو بھائی کن داموں لے آئے امّی ؟"

"ایک روپیہ چار آنے سے لے آیا ہے بٹیا۔ صرف ایک روپیہ چار آنے گز۔"

"آدھے کو آدھا فرق امی" !!

"ہاں بٹیا ہاں ۔۔۔ بلا کا ہوشیار ہے یہ لڑکا ۔۔ مٹی سے سونا اگائے گا۔"

"اللہ دجو بھائی آپ کتنے اچھے سے ہیں ۔۔۔ طاہرہ آپا تو بس ٹھاٹھ کریں گی امّی !"

اور واجد میاں اپنی تعریف و توصیف سن سن کر لاجونتی کی طرح لجاتے رہتے انکساری سے اس راز کا افشاء کر دیتے کہ انھیں اتنے کم داموں پر کپڑا کس طرح دستیاب ہو جاتا ہے۔

خالہ امی" بات دراصل یہ ہے کہ کپڑے کا جو سب سے بڑا تھوک بیوپاری ہے ناسوہن لال اس سے میری زمانے سے ملاقات ہے بلکہ آپ دوستی سمجھیے ۔ بلکہ ۔ بلکہ اب میں آپ سے کیا چھپاؤں بے چارا معمولی سا آدمی ہے ۔ اپنی کمپنی سے ابا کو کہہ کر میں نے اس کو قرض دلوایا ۔ بس اسی رقم سے اس نے کپڑوں کا دھندہ شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے آج شہر کا بڑا بیوپاری بن بیٹھا ہے ۔ مجھے وہ سارا کپڑا مل کے بھاؤ سے دیتا ہے ۔ ایک پیسہ بھی منافع نہیں لیتا۔"

"تم سے بھلا کیسے منافع لے گا میاں ۔ تمہاری جوتیوں ہی کا طفیل ہے جو آج وہ سیٹھ بن بیٹھا ہے ۔ خالہ بھی واجد میاں کی تعریفوں کے پل باندھتیں اور بھوری بیگم پھولی نہ سماتیں ۔

پھر خاندان بھر میں واجد میاں کے اس کارنامے نے پلک جھپکنے تک وہ شہرت پائی کہ کیا صاحبزادے گگا ڈن اور کیا میاں مٹھو ن نے دنیا بھر میں پائی ہو گی ۔

بھوری بیگم کے ہر چاہنے والے نے واجد میاں کو زحمت دی ۔ اور واجد میاں خوشی خوشی ہر قسم کا کپڑا بازار کے آدھے داموں مل کے ریٹ سے خاندان بھر کے لیے فراہم کرتے رہے ۔ عمدہ سے عمدہ ساریاں کم سے کم داموں دلائیں ۔ اچھی سے اچھی شرٹنگ اونے پونے دلا دی ۔ وہ تو خریداری کی قوت خرید ہی نے جواب دے دی ۔ اب بھلا لوگ کھانا پینا سب کچھ چھوڑ کر صرف کپڑا ہی خریدنے سے تو رہے ۔ جس سے جتنا ہو سکا اس سے بڑھ چڑھ کر اس نے لیا اور واجد میاں خدمت خلق نہیں خدمت خویش و اقارب سے خوش ہوتے رہے ۔

واقعی واجد میاں کو اس کام میں ملکہ تھا۔ آئے دن مختلف قسم کے بیوپاریوں سے ملنا جلنا، اٹھنا، بیٹھنا، پھر مال کے ایسے پارکھ کہ کبھی نہ چوکتے۔ زندگی کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت ایسی قیمت میں فراہم کر دیتے جس کا حصول کسی دوسرے کے لیے ان داموں میں ممکن ہی نہ تھا۔

چھوٹی ممانی بھی بھوری بیگم کی کچھ مخالف تھیں۔ واجد میاں کا طاہرہ سے ادھر انھیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس معاشقہ کی انھوں نے بڑی تشہیر بھی کی تھی۔ واجد میاں ان کے ہاں کم ہی جاتے تھے۔ ایک دن واجد میاں کی امی نے کام سے اپنے بھائی کے گھر واجد میاں کو بھیجا۔

بادل ناخواستہ ہی، تعمیل حکم میں وہ چلے گئے۔ ماموں تک امی کا پیام پہنچایا۔ لوٹنے لگے تو ماموں نے چائے کے لیے روکا۔ ممانی نے اپنے نئے ٹی سیٹ کی نمائش کے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے بھی واجد میاں کی مدارات میں کسی اخلاص کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن واجد میاں تو بس کسی بھی اچھی چیز کے رسیا تھے۔

ٹی سیٹ انھیں پسند آیا اور انھوں نے دل کھول کر ممانی سے اس کی تعریف کی۔ جب قیمت پوچھی تو ممانی نے پچیس روپے بتلائی۔

واجد میاں پر تو بس بجلی ہی تو گر گئی۔ جیسے ان کے ماموں کو کسی نے ہزاروں میں ٹھگ لیا ہو۔

"کیا قیمت بتائی ممانی جان آپ نے؟" انھوں نے جیسے اپنی جگہ سے اچھل کر پوچھا۔

"پچیس پورے روپے میاں۔"

"سچ بہت قیمت دے دی آپ نے؟"
حمائی نے کچھ چیں بجبیں ہو کر کہا۔" تو کیا میں تم سے جھوٹ کہوں گی؟"
واجد میاں سنبھلے۔" نہیں یہ بات نہیں۔ آپ نے کسی ملازم سے تو نہیں منگوایا!"
"نہیں بھئی میں خود آج ہی لے آیا ہوں"۔۔۔ ماموں بیچ میں بول اٹھے۔
"آج ہی خریدا ہے آپ نے؟" واجد میاں نے مزید تصدیق چاہی۔
"آج ہی نہیں بلکہ ابھی ابھی لائے ہیں یہ" حمائی نے تصدیق کی۔
"تو پھر فوری واپس کر دیجئے۔" واجد میاں نے اصرار کیا۔
"آخر کیوں بھئی" ماموں نے کچھ بے کل ہو کر پوچھا۔
"میں یہی ٹی سیٹ صرف سترہ روپے میں آج ہی لا دوں گا۔" واجد میاں بولے۔
"سچ؟"
"جی ہاں بھلا آپ سے جھوٹ کہہ سکتا ہوں؟"
"میں کہتی ہوں نا۔ تمہیں ڈھنگ سے کوئی چیز خریدنی ہی نہیں آتی۔ ٹھگ لیا ہے ایمان نے تمہیں۔۔۔ پورے نو روپے زیادہ لیے پاجی نے۔۔۔ جاؤ بھئی اب لوٹا آؤ جلدی سے۔" حمائی نے ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہہ دیں۔

ماموں نے ٹی سیٹ ڈبے میں پیک کر لیا۔۔۔ تو واجد میاں کہنے لگے۔ چلیے میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔ آپ سے پیسے وہیں لے لوں گا اور آج رات بالکل ہی ٹی سیٹ خدمت میں پہنچا دوں گا۔ میں ابھی آپ کو لا دیتا لیکن جس دکان سے مجھے لینا ہے وہ بہت دور ہے اور مجھے دوسرے کام بھی ہیں اس وقت۔

ماموں نے ٹی سیٹ واپس کر کے واجد میاں کو سترہ روپے دے دیئے اور نور دیئے گھر آکر بیوی کے ہاتھوں میں رکھے تو وہ خوش ہو گئیں۔ کہنے لگیں "واجد بڑا سمجھدار اور پیارا لڑکا ہے۔ بڑا کاروباری۔ بڑا لال جیلی۔

میں اپنی نند سے کہوں گی طاہرہ کو جھٹ پٹ اپنی بیٹی بنا لیں۔
اودھر بجلی کے سوئچ آن ہوئے ہی تھے کہ واجد میاں مسکراتے ہوئے پہنچے۔
بالکل ویسی ٹی سیٹ ۔ ساتھ میں سترہ روپئے کی باضابطہ رسید۔
ممانی نے گلے لگا کر پیشانی چوم لی " میں اب میاں جو کبھی خریدوں گی تمہارے مشورے سے خریدوں گی۔ یہ تمہارے ماموں تو بس گھر کا دیوالہ ہی نکال دیں گے"

اور واجد میاں بیٹھے لجاتے اور مسکراتے رہے۔
لوگ کہتے ہیں شرم و حیا لڑکیوں کا زیور ہے۔ لیکن واجد میاں نے بڑی چاؤ سے یہی زیور خود پہن رکھا تھا۔ شرم ان کا مزاج تھی تو حیا ان کی فطرت اب شرم و حیا کے ان پردوں سے باہر نکل کر طاہرہ تک ایک جست میں پہونچ جانا ان کی فطرت کے مغائر تھا۔ ان کے مزاج کے منافی۔
لیکن محبت بھی کوئی ایسا درخت تو ہے نہیں جو کسی بنجر زمین میں لق و دق صحرا میں آپ ہی آپ پھلتا پھولتا رہے۔ اور ادھر اس ننھے سے پودے کی آبیاری کرنے والے ہاتھ خود اگر اتنے نازک ہوں کہ ہوا کا ہر سرد گرم جھونکا ان سے مس ہو کر انہیں چھوئی موئی کی طرح مرجھا دے تو محبت کا پروان چڑھنا موہوم۔ آخر شش ہوا بھی یہی۔
طاہرہ کی سہیلیوں نے خود اپنے کانوں سے سنا کہ طاہرہ مسکین بھابی سے کہہ رہی تھی " اللہ واجد بھائی کا نام لے کر آپ مجھے کیوں چھیڑتی ہیں ۔۔۔ وہ تو میرے

سگے بھائی ہیں۔ سگ ــــ گے بھائی "

اور مسکین بھائی کے چہرے پر کلیاں سی کھل گئی تھیں۔

مسکین بھائی چار پانچ محبتوں کی اچھی بری یادیں زادِ سفر کے طور پر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اس فن انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ تجربہ کار کھلاڑی تھے۔ طاہرہ جیسی لڑکی جو ہر جگنو کی چمک کو اجالوں کا پیام سمجھ بیٹھتی تھی۔ مسکین میاں کی سرچ لائٹ میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ آنکھیں ایسی خیرہ ہوئیں جیسے پٹی پڑ گئی ہو۔"

اللہ وجّو بھیا تو میرے سگ گے بھائی ہیں "

" اللہ واجد بھیا تو میرا سگ گا ــــ سگ گا بھائی ہے "

ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ واجد میاں کو طاہرہ کے پاس بیٹھا ہوا دیکھ کر مسکین میاں نے آتے کے آتے طاہرہ کو چھیڑا " مبارک مبارک "

" اوئی ــــ وجّو بھیا تو میرا سگا بھائی ہے "

" کیوں تو ہے نا میرا سگا بھائی ؟"

اور واجد میاں کے پیروں کے نیچے ساری دھرتی، ڈول کر رہ گئی - یا اللہ یہ کیا ہوگیا طاہرہ کو ؟

پھر یہ دھرتی خاندان بھر کے قدموں کے نیچے ڈول گئی۔ کسی نے طاہرہ سے ہمدردی کی۔ کسی نے بے وفا ٹھہرایا۔

" سنتے ہو بھئی ــــ بھوری بیگم کی لاڈلی کے کرتوت ــــ واجد میاں کو حقیقی بھائی کہنے لگی ہے اور وہ بے چارا ہے کہ آج تک اپنے سینے میں الاؤ سا

سلگائے خاندان بھر کا کوڑا کرکٹ اسی الاؤ کے لیے چنتا پھر رہا ہے۔"

"کیا کرے گی بھلا ـــ انتظار میں کوئی عمر بتانے سے تو رہا۔ واجد میاں الاؤ جلائے رکھیں یا آتش فشاں سینے میں بسا لیں۔ طاہرہ خود بھی تو ایک جلتی ہوئی بھٹی ہے ـــ الاؤ کی آنچ آنکھوں سے چھپی تو نہیں رہتی۔ آتش فشاں پھٹ بھی تو پڑتا ہے۔ لیکن اس جلتی ہوئی بھٹی کا کیا ہوگا جس کے شعلے اپنے ہی دھوئیں میں چھپ جاتے ہیں۔"

مسکین میاں نے اس بھٹی پر پیار کی اتنی بارش کی کہ آخر ش کونپلیں پھوٹ آئیں۔

بھوری بیگم بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہ گئیں۔

مسکین میاں امڈے ہوئے بادل کی طرح چھائے۔ ٹوٹ ٹوٹ کر برسے اور بادل چھٹے تو کھیتی لہلہا رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ بھوری بیگم کیا سب کے سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

خاندان بھر کے چہیتے واجد میاں، بھوری بیگم کے داماد نہ بن سکے۔ ان کی پیار کی لہلہاتی کھیتی پر واجد میاں کی ماں نے کھلے بندوں ٹڈی دل کی طرح یلغار بھی نہیں کی، لیکن ان کی فطرت میں شرم و حیا کا لبادہ اوڑھ کر جو بزدلی چھپی بیٹھی تھی وہ بھی تو واجد میاں کی ماں ہی نے ان کے سینے میں چھپا دی تھی۔ جس کا احساس واجد میاں کو اس وقت ہوا جب طاہرہ نے ان سے پوچھا۔

"کیوں رے تو ہے نا میرا سگا بھائی ـ!"

لیکن یہ خلش بھوری بیگم کے دل میں جیسے جاگزیں ہو کر رہ گئی۔

کیسا کماؤ پوت داماد ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ خاندان بھر میں جس کی ہوشیاری سے زیادہ جس کے کاروبار کی دھوم تھی۔ نہیں تو ہر اس شخص کو چاہا تھا جس کو بھوری بیگم نے اپنا سمجھا۔ خاندان بھر کی ضروریات اس نے آدھی قیمتوں میں فراہم کیں جب گھر میں نکل جاتا ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ کیسا خاموش شرمیلا سا۔

بھوری بیگم کانپ کر رہ جاتیں۔ اس کی ہائے نہ لگ جائے کہیں طاہرہ کے بسے بسائے گھر کو۔

طاہرہ کے بسے بسائے گھر کو تو ہائے وائے لگی نہیں ـــــ ہاں واجد میاں اندر ہی اندر ایسے بیٹھے لگے جیسے مٹی کا گھروندا پانی پڑتے ہی ڈھے جائے۔

ایک دن وہ بھوری بیگم سے ملنے آئے تو طاہرہ نے اپنی نئی ساری انھیں دکھلائی جو وہ پہنے ہوئے تھی۔

دیکھو بھیا" یہ مسکین نے میرے لیے چھتیس روپے میں دلائی ہے" واجد میاں ساری دیکھ ہی رہے تھے کہ چھوٹے ماموں آدھمکے۔

آداب سلام کے بعد سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو واجد میاں نے ساری کا پلّو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا۔ بہت تعریف کی ـــ پھر آہستہ سے کہا ـــ بھئی چھتیس روپے بہت دے دیے مسکین نے ـــــ بائیس چوبیس سے زیادہ کی نہیں ہے۔

" تو لوٹا دوں اسے" طاہرہ نے پوچھا۔

" بالکل لوٹا دو بھئی" واجد میاں بولے۔

" تو لا دے گا نا بھیا بائیس روپے میں" ـــ طاہرہ نے مزید اطمینان کرنا چاہا۔

" ہاں بھئی لا دوں گا"

ماموں بیچ میں بول اٹھے — "بھئی مسکین میاں جہاں سے لائے ہیں اس دوکان کا پتہ بتلا کر انھیں کو دے دو تا — یہ اس ساری کو لوٹا بھی دیں گے اور ایسی ہی دوسری لا بھی دیں گے"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" واجد میاں بولے۔

ماموں کہنے لگے "وجو! تمھیں یاد ہے نا ہمارا ٹی سیٹ لوٹا کر تم نے نورو پے بچائے تھے" واجد میاں نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ پھر اس طرح تڑپ کر ماموں کو دیکھا جیسے کچھ کہہ دینا چاہتے ہوں۔ لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکے — یہ بھی نہ کہہ سکے کہ میں اپنے ہی گھر میں لوٹ لیا گیا ماموں، لیکن مجھے نہ آپ نے بچایا نہ بھوری چچی نے۔

طاہرہ نے ساری بدل کر نئی ساری تو لادی وہ ہاتھوں میں لے کر اٹھے اور چھپکے سے باہر نکل گئے۔

ماموں نے کہا "بھوری" دیکھا تم نے وہ آب دیدہ ہو کر بھاگا ہے یہاں سے — بڑا بے زبان سا لڑکا ہے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے۔ خاندان بھر میں چاہے جانے کی خاطر اس نے کیا کیا نہیں کیا" اور ماموں نے ذرا جھک کر بھوری کے کان میں کہا "یہ سب کچھ غریب نے طاہرہ کو حاصل کرنے کے لیے کیا تھا"

"ہمیں بھی سنائیے نا ماموں" طاہرہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹی — میں کہہ رہا تھا عجیب احمق سا لڑکا ہے — ایک بار میں نے ایک ٹی سیٹ چھبیس روپے میں خریدا تھا۔ اس نے کہا بہت مہنگا لیا ہے، سترہ روپے میں ملتا ہے۔ بس اتنا سننا تھا کہ تمہاری ممانی گلے کا ہار ہو گئیں کہ جاؤ لوٹا آؤ فوری — میں واجد میاں کے ساتھ ہی جا کر وہ ٹی سیٹ لوٹا آیا اور

سترّہ روپے انھیں دے دیئے کہ وہ ایسا ہی لا دیں۔ اسی روز واجد میاں نے ٹی سیٹ ہمیں لا دیا۔ یہ سیٹ انھوں نے پھر اسی قیمت میں اسی دوکان سے خرید لیا اور کمی کے پیسے جیب سے خود پورے کر دیئے۔ مجھے یہ بات کچھ دن بعد اسی دوکان والے نے بتلائی کہ وہ ٹی سیٹ وہی صاحب خرید لے گئے، جو لوٹاتے وقت آپ کے ساتھ تھے اور میں بس ششدر رہ گیا۔

" ایسا کیوں کیا ماموں " ــــ طاہرہ نے سوال کیا۔

" تعریف نکلتی ہے نا کبھی ــــ وہ کام جو کوئی نہیں کر سکتا وہ انھوں نے یوں کر دکھایا۔

" ہائے اللہ " طاہرہ کا منھ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

" تو امّی انھوں نے جو کپڑے کم دامون میں " ــ طاہرہ، پھوپی بیگم سے مخاطب ہی ہوئی تھی کہ ماموں نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔

" اب یوں ہر بات کی تہہ میں جانا بھی کیا ضروری ہے ؟ "

" طاہرہ نے دل ہی دل میں سوچا، کتنے ڈھنگے واموں ہمیں حاصل کرنے چلے تھے وتو بھیا اور کتنے سستے واموں اپنی ہی بزدلی کے ہاتھوں مجھے بیچ دیا "

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ـ " اللہ وتو بھیا بے چارے۔

ماموں بھی ہنس پڑے اور پھوپی بیگم بھی۔

ــــ ــــ

مورتی

مجھے معلوم ہوا کہ نئے اسٹیشن ماسٹر نے ایک چٹھی ابا کے نام راز میں بھجوائی ہے۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ اس لیے بھی کہ میں قصور وار نہ تھا، تو بے قصور بھی تو نہ تھا، مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ادھر کچھ دنوں سے نیا اسٹیشن ماسٹر ہماری حرکات و سکنات پر بغور نظر رکھ رہا ہے۔ اس لیے ہم نے اس کے گھر کا طواف پہلے کے مقابلہ کم بھی کر دیا تھا۔ پھر بھی پی کاک آتا تو ہم کسی نہ کسی بہانے اس کا ساتھ دینے پر مائل ہو جاتے۔

پی کاک ہمارا بڑا پیارا دوست تھا۔ بڑا زندہ دل۔ اس کا نام تھا دیوی سنگھ۔ موجودہ اسٹیشن ماسٹر سے پہلے جس کی چٹھی ابا کے نام آئی تھی، دیوی سنگھ کے والد بھی اسی مقام پر ریلوے اسٹیشن ماسٹر ہی تھے۔ ان کا تبادلہ

چونکہ کہیں دور دراز ہو گیا تھا اس لیے اپنی بیوی بچوں کو فی الوقت انھوں نے یہیں چھوڑ دیا تھا اور خود عارضی طور پر اس نئے مقام پر چلے گئے تھے جہاں ان کی تعیناتی عمل میں آئی تھی اور وہ اپنے تبادلے کے لیے کوشاں تھے۔ وی ڈی ینگمن کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جو یہیں مڈل اسکول میں پڑھتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ پی کاک کے ابا کا تبادلہ ہوا تو ہم بے انتہا مغموم ہو گئے تھے اور جب گرما کی تعطیلات یہاں وودھان پور میں گزار کر جب ہم اپنے اپنے کالج کو لوٹنے لگے تھے تو پی کاک مجھ سے چمٹ گیا تھا اور ہماری آنکھیں بھیگ گئی تھیں لیکن مجھے اس نے فوراً ہی خط سے اطلاع دی تھی کہ اس کے والد فی الوقت اس کے بھائی اور ماں کو یہیں چھوڑ رہے ہیں کیونکہ وہ نیا مقام جہاں اب ان کا تبادلہ ہوا ہے، بے حد تکلیف دہ ہے۔

اس طرح میری اور پی کاک کی دوستی وودھان پور میں ابا کی اور سابقہ اسٹیشن ماسٹر کی ملازمت کے سبب ہو گئی تھی۔ ایک اور صاحب بھی تھے کسی منصف مجسٹریٹ کے صاحبزادے تھے ان کا نام تھا مجیب الدین۔ بڑے شرمیلے سے تھے۔ بالکل چھوئی موئی کی طرح۔ وہ ٹہلنے کو نکلتے اور ہم انھیں دیکھتے رہتے۔ تو وہ بیچارے اپنی چال ہی بھول جاتے۔ آہستہ آہستہ جب وہ ہمارے دوست ہوئے تو پتہ چلا کہ ان کی یہ انفعالیت ان کی بیمار جنسی گھٹن کا باعث ہے جو بہت ہمت کرتی ہے تو تصور اور اپنے ہاتھ کا سہارا لے کر مطمئن ہو جاتی ہے۔ پہلے پہل تو وہ ہم سے کھلے نہیں۔ کچھ دن گزر گئے تو ایک دن پی کاک نے یکایک ایک عجیب حرکت کر دی، اس نے مجیب کے ساتھ جو چپراسی تھا اس کو ڈانٹا کہنے لگا کہ وہ

اسی وقت واپس چلا جائے۔ مجیب کوئی بچہ نہیں ہے، شام ہو گی تو وہ خود گھر لوٹ آئے گا۔ چپراسی نے پس و پیش سے کام لیا تو وہ اور برہم ہو گیا۔ کہنے لگا مجسٹریٹ صاحب سے کہنا کہ کلکٹر صاحب کے لڑکے نے مجھے ڈرا دھمکا کر بھگا دیا کہ میں سائے کی طرح مجیب میاں کے ساتھ نہ رہوں۔ یہ اشارہ میری طرف تھا۔ ابا کلکٹر تھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ مجیب شام کو چہل قدمی کے لیے نکلا تو ایک چپراسی اس کے پیچھے پیچھے اس کی رکھوالی کے لیے رہتا۔ خیر صاحب جب یہ چپراسی چلا گیا، تو پی کاک نے مجیب کی بانہہ پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچا اور اس کے سینے سے بھینچ کر اس کے گالوں پر چٹا چٹ کئی بوسے ثبت کر دیے۔

مجیب کا حال دیدنی تھا۔ گوری رنگت سرخ ہو اٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ احتجاجاً کچھ کہتا، خود پی کاک نے اسے جھاڑ بتائی۔ کہنے لگا کہ اب کبھی وہ ملنے جلنے میں عورتوں کی طرح شرمائے گا تو بھرے بازار میں اس کے پیار لے گا وہ۔ مجیب نے ایک نرم سی ہلکی پھلکی گالی دی اور اس دن سے بے تکلف ہو گیا۔ اور واقعی ہمارے ساتھ جوں جوں اس کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ ہوا اس کی نسائیت کم ہوتی گئی۔ یہ پی کاک کا ہی اثر تھا وہ مجیب کی تنبیہہ کرتا رہتا۔

یہاں بات یہ ہے کہ جب اس کا نام دیوی سنگھ ہے تو میں اس کا پی کاک کیوں کہہ رہا ہوں۔ دیوی سنگھ اپنے گھر میں دیوی ہو گا، یا دیوتا، یا سب کچھ ہو گا۔ ہمارے لیے تو وہ بس پی کاک تھا۔ ہم دوستوں میں اس کی شخصیت بھرپور طور پر ابھر سکتی تھی، تو بس اسی ایک نام سے ــــــ میں آپ کو ذرا وضاحت سے ساری باتیں سنا دوں، تو خود آپ کو دیوی سنگھ، پی کاک ہی کے نام سے بھلا لگے گا۔

کالج کا یہ کھلنڈرا طالب علم بیک وقت دو متضاد چیزوں کا رسیا تھا۔ ایک کتاب اور دوسرے عورت۔ عورت کہیں رہے، کسی روپ میں، کسی عمر کی وہ اس کو ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے وہ دیکھ نہیں رہا ہو بلکہ کپڑے نوچ رہا ہو۔ عورتیں بھی اس کی نظروں کے وار کو فوری محسوس کرتیں اور لجا کر سمٹ کر رہ جاتیں۔ بعض ایسی بھی ہوتیں جو سینہ تان کر ہر وار سہنے کے لیے تیار ہو جاتیں لیکن کبھی کبھی اسے ایسی عورت سے بھی سابقہ پڑ جاتا جس کے جسم پر پی کاک کی چبھتی ہوئی نظروں کا کوئی اثر ہی نہ ہوتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے اس کی نظروں کی کرنیں سوئیاں بن کر آنکھوں میں دھنس رہی ہیں۔ لیکن مورنی تو ایک ایسی عورت تھی، جو پہلی، دوسری اور تیسری شق میں کہیں بھی شامل نہ کی جا سکتی تھی ـــــــ وہ تو ایک چلتا پھرتا ایسا جادو تھی جس کا اثر مرد پر کم خود اس کی ذات پر زیادہ ہوتا تھا۔ کوئی مرد اس کو دیکھے یا نہ دیکھے وہ خود کسی مرد کو دیکھ کر پسینہ پسینہ ہو سکتی تھی۔ پی کاک اسی مورنی سے آنکھیں لڑانے کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔ اس کو ان باضابطہ ریاض کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کی بالکنی پر سے کئی بار اس کو کھڑی دوپہر میں ہیٹ لگائے پانی کی اس ٹنکی کے نیچے پہروں کھڑا ہوا دیکھا تھا، جو مورنی کے دریچے کے سامنے تھوڑے سے فاصلے پر تھی۔

نظر بازی کا یہ سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ پی کاک رات رات بھر چاندنی میں چمکتی ہوئی ریل کی پٹڑیوں پر بیٹھا مورنی کو تاکا کرتا۔ پانی کی ٹنکی کے فولادی ستون کی اوٹ سے اس نے نظارہ بازی کے ایسے زاویے بنا رکھے تھے کہ مورنی کے کمرے کی ایک ایک چیز آسانی سے نظر آ سکتی تھی اور وہ چھپ چھپ کر مورنی کو چلتا

پھرتا ہوا، بیٹھا ہوا، لیٹا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

مورنی کوئی حسین عورت نہیں تھی۔ لیکن سجل ضرور تھی، اس کو دیکھ کر گملے یا گلدان میں سجے ہوئے پھولوں کا خیال نہیں آتا تھا۔ پھولوں سے لدی کسی ایسی جنگلی بیل کا خیال ضرور آتا تھا جو کسی کمزور درخت سے چھٹ کر رہ گئی ہو اور جس سے کوئی انسانی ہاتھ آج تک مس نہ ہوا ہو۔

مورنی سے پی کاک کی راہ و رسم مذاق مذاق میں یہ صورت اختیار کر گئی تھی۔

پی کاک کے والد کا تبادلہ ہوا تو نیا اسٹیشن ماسٹر دھان پور آیا۔ اس کے ساتھ اسباب خانہ کے علاوہ کچھ تھا تو اس کی جیتی بیوی تھی، وہ بھاری بدن کا جوان آدمی تھا لیکن اس کو دیکھ کر ایک ایسے سانڈ کا خیال آتا تھا جو پٹریوں کے بیچوں بیچ جگالی کرتے ہوئے ریلوے انجن کے سامنے کھڑا اپنے شباب سے بے خبر ہو گیا ہو۔ وہ بڑا کم سخن تھا۔ اس کی مونچھیں جھکی ہوئی تھیں، بالکل اس کی جھکی جھکی نظروں کی طرح ـــــ وہ اپنے گھر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن تک جاتا تھا تو آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو اس طرح کنکھیوں سے دیکھتا جیسے یہی انداز نظر اس کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔ ہم لوگوں کو اپنے گھر کا طواف کرتے ہوئے دیکھ کر بھی اس کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ کبھی ہم سے نظریں چار کر کے اس التفات بے جا کی نسبت باز پرس کرے۔ وہ اس طرح محجوب سا ہمارے برابر سے گزر جاتا جیسے ہم سے ڈرتے ڈرتے اپنے گھر جا رہا ہو۔

مورنی کی چال بڑی قیامت کی تھی۔ ہم اس کو کنوئیں سے پانی بھر بھر کر لے

لے جاتا ہوا دیکھنے اور دیکھتے ہی رہتے۔ واقعی یہ منظر دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا، آپ نے جنگل میں مور کو ناچتے ہوئے کبھی دیکھا ہے؟ آپ نے ہرن کو چوکڑی بھولتے ہوئے کبھی دیکھا ہے؟ مورنی منٹ دو منٹ کے وقفے سے یہ دونوں منظر یکے بعد دیگرے پیش کرتی۔ وہ اپنی چھوٹی سی خوبصورت سی پیتل کی مٹکی ایک جھکولے سے دوہری ہو کر کمر پر ٹکانے کے لیے اٹھا لیتی تو ایسا معلوم ہوتا، جیسے پھلوں سے لدی ہوئی ٹہنی چٹختے چٹختے رہ گئی ہے۔ یا پھر وہ ڈول کر ٹوٹ گئی ہے ــــ پھر وہ مٹکی کو کولھے کا سہارا دیے کچھ اس طرح چلتی جیسے مورنی جنگل میں ناچ رہی ہو، دیوی سنگھ نے اسی خرام ناز پر فریفتہ ہو کر اس کا نام مورنی رکھا تھا۔ ہم برابر سے گزرتے ہوئے اس کو اس بات کا احساس دلاتے کہ ہم صرف اسی کے لیے یہاں چکر لگاتے پھرتے ہیں، تو وہ اپنی متوالی چال اس طرح بھول جاتی جیسے ہرنی چوکڑی بھرنا بھول جاتی ہے۔ اس کی گاگر سے پانی چھلک چھلک کر جب گرتا تو ایسا لگتا جیسے مورنی کی ساری ہستی سوکھی دھرتی پر آبشار بن کر گر رہی ہے۔

جب سے دیوی سنگھ نے نئے اسٹیشن ماسٹر کی بیوی کو مورنی کا نام دیا، ہم نے اس کو بی کاک پکارنا شروع کر دیا۔

ہنسی ہنسی میں بات کچھ اس طرح چلی تھی کہ دیوی سنگھ اور مجیب شام کو میرے پاس آجاتے، ہم تینوں چہل قدمی کے لیے نکلتے تو ہمیں پانی کی ٹنکی سے ہو کر گزرنا پڑتا۔ ٹنکی کے سامنے ہی نئے اسٹیشن ماسٹر کا کوارٹر تھا۔ ہم پہلی بار اُدھر سے گزرے تو دیوی نے ٹھوکے دے کر ہماری توجہ مورنی کی طرف

منڈل کرائی، جو اپنے لانبے بال شانوں پر بکھرائے انھیں کنگھی سے سلجھا رہی تھی، پانی کی ٹنکی کے نیچے پہنچ کر دیوی نے کہا "بابا اب میں یہاں سے ایک قدم آگے نہیں چلنے کا۔ ہمت ہو تو تم لوگ بھی ٹھہرو، ورنہ چلتے بنو۔"

میں اور مجیب کچھ پس و پیش کے بعد آگے بڑھ گئے تو دیوی اطمینان سے ٹنکی کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھ گیا ہم نے کچھ دور جا کر پلٹ کر دیکھا تو وہ چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا کر ٹنکی کے نیچے ایک اتھلے سے گڑھے کے ٹھہرے ہوئے پانی میں اپنی قوت سے مار رہا تھا کہ آواز ہمیں بھی سنائی دے رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اسٹیشن ماسٹر کی بیوی کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا، جو کھڑکی میں کھڑے زلفیں سلجھا رہی تھی۔

اس کے بعد کچھ دنوں تک ہمارا یہ معمول ہو گیا کہ بس شام ہوئی اور پانی کی ٹنکی کے نیچے جا پہنچے۔ ایک دو دن تو وہ ہمیں دیکھ کر کبھی کھڑکی میں کبھی دروازے کی اوٹ میں آ کھڑی ہوئی۔ لیکن پھر ہمیں دیکھتے ہی وہ چھپ جانے لگی۔ کچھ دیر منتظر رہنے کے بعد میں اور مجیب تو آگے بڑھ جاتے، دیوی وہیں ڈٹا رہتا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی آ کر ہم میں شامل ہو جاتا لیکن جب بھی آتا بڑا مطمئن اور فاتحانہ۔ مجیب کو چھیڑتا کہ تمہارے لیے تو کسی عورت کو بس ایک نظر دیکھ لینا ہی بہت ہے۔ اس کے بعد تم اسے اپنے تصوّر میں لا لا کر خراب کرتے ہو۔ تمہارے لیے ہجر کا لفظ بے معنی ہے۔ بس کسی پر نظر پڑی اور اسی شب وصال ہو گیا۔ وہ کچھ بگڑتا، کچھ شرماتا، تو دیوی جھک کر اس کے کان میں کہتا کہ "مورنی کے ساتھ یہ سلوک نہ کرنا، وہ میری ہے۔"

اور واقعی اب وہ پھر پورا اعتماد کے ساتھ مورنی کو اپنی کہنے لگا تھا۔ اس خوش اعتمادی کی وجہ صرف یہ تھی کہ مورنی پانی کی ٹنکی سے میرے اور مجیب کے چلے جانے کے بعد جب دیوی کو تنہا کھڑا دیکھ پاتی، تو اس کو چھپ چھپ کر جھلک دکھاتی۔ بعد میں تو بات یہاں تک پہنچی تھی کہ دیوی خود ہمیں منع کرنے لگا تھا کہ ہم ٹنکی کی طرف نہ آئیں۔ اس لیے کہ اس کا رومانس ان دنوں شباب پر ہے۔

اس پوری رومانی مہم کے سر کرنے کا سہرا چونکہ دیوی ہی کے سر جاتا تھا۔ اس لیے ہم نے بلا اختلاف رائے اس کو اپنا ہیرو تسلیم کر لیا اور اس کے راستے سے ہٹ آئے بس اسی دن سے وہ پی کاک پکارے جانے لگا اور نئے اسٹیشن ماسٹر کی بیوی کو تو اسی نے مورنی کا خطاب دے رکھا تھا۔

دیوی، اپنے بڑھتے ہوئے تعلقات کی روداد ہمیں سناتا۔ ایک دن اس نے ہمیں بتایا کہ اب تو باضابطہ سلام و پیام بھی ہونے لگے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ بہت جلد تمہارا پی کاک، مورنی کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھا اسی کھڑکی میں سے تم دونوں کو اشارے کرے گا اور تم دونوں پانی کی ٹنکی کے نیچے کھڑے میری قسمت پر رشک کیا کرو گے۔

پی کاک تو فتح مندی کے ایسے خواب دیکھ رہا تھا اور ادھر نئے اسٹیشن ماسٹر نے ابا کے نام ایک چٹھی بھجوا دی تھی جس میں اس نے پی کاک کی اور مجیب کی شکایت لکھی تھی کہ یہ دونوں دن اور رات کا بیشتر حصہ اس کے مکان کے اطراف گھومنے اور اس کی بیوی کو تاکنے اور اشارے کرنے میں گزارتے ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ آپ کے صاحبزادے بھی کبھی کبھی ان لوگوں کے ساتھ

ہوتے ہیں لیکن شاید اس کو نہیں معلوم کہ ان کے یہ دونوں دوست کس مقصد کے تحت میرے گھر کے چکر لگاتے ہیں۔ اس لیے بڑی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے ابّا سے استدعا کی کہ وہ میرے توسط سے میرے دوستوں کو ادھر کا رُخ کرنے سے باز رکھیں۔ ورنہ وہ پولس میں پی کاک اور مجیب کے خلاف رجوع ہو جائے گا۔ اس نے اپنی بیوی کے حوالے سے یہ بھی لکھا کہ جب بات بہت بڑھنے لگی، تو کئی بار اسٹیشن پر آدمی بھیج کر چٹھی کے ذریعہ اس کی بیوی نے اس کو اطلاع دی کہ یہ لوگ پھر گھر کے سامنے آموجود ہوئے ہیں۔

ابّا نے مجھے بلایا تو میرا عالم دیدنی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نیچے نیچے کہیں دھنسی جا رہی ہے اور میں بھی اس کے تعاقب میں بلندیوں پر سے چھلانگ لگا کر نیچے آ رہا ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کس طرح ان کے سامنے جا کر کھڑا رہ سکا۔ انھوں نے اسٹیشن ماسٹر کا خط میری طرف بڑھا دیا۔ مجھ میں نظر ملانے کی تاب نہ تھی۔ انھوں نے کہا میری طرف دیکھو۔ میں نے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کہنے لگے۔ تمہارے دوستوں کی بُری صحبت کے تعلق سے مجھے سوچنا پڑے گا۔ یہ باتیں تکلیف دہ حد تک بُری ہیں۔ آئندہ سے میں اس قسم کی کوئی شکایت نہیں سنوں گا۔ جاؤ یہ خط پڑھ لو۔ کن افسوس ناک حالات میں مبتلا ہو گئے ہو تم لوگ۔

میں نے شام کو خط پی کاک اور مجیب کو دکھلایا، تو مجیب نے فٹ فٹ قسمیں کھا لیں کہ اب کبھی وہ پانی کی ٹنکی کا رُخ نہیں کرے گا۔ لیکن پی کاک جیسے پتھر بن کر رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چہرے پر ہمیشہ جو ایک

گلستاں کھلا رہتا تھا۔ وہ آج ایک ایسا ویرانہ بن گیا ہے جس نے نو دروبست کی بھی صورت کبھی نہیں دیکھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے پی کاک اداکاری کر رہا ہے۔ اس حادثے کو اپنی عمر دگی سے کچھ ایسا روپ دے رہا ہے کہ اس وقت بھی ہم اس سے ہمدردی کرنے کے قابل خود کو بنا سکیں۔ لیکن اس کا یہ اندازِ خود نمائی مجھے کچھ جچا نہیں۔ مجیب تو خیر توبہ استغفار پر اتر آیا تھا۔ اس کی انفعالیت اس کے لیے سپر بن گئی تھی اور وہ پوری ایمانداری سے یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ واقعی اس لیے غلط تھا کہ یہ سب کچھ "پی کاک" کے اکسانے اور ترغیب دلانے پر ہوا تھا۔ ورنہ اس کا مزاج تو بس یہی تھا کہ عورت کو ایک بار دیکھا اور اپنے ذہن میں بسا لیا۔ جب ضرورت پڑی، ذہن کی چار دیواری سے اس کو نکال کر اپنے پہلو میں لے آیا۔ اس میں نہ بدنامی کا خدشہ تھا۔ نہ کسی کے عتاب کا خوف۔ بس دل کو جو بھا گیا، نہ کوئی روک نہ مزاحمت، نہ پہرہ بندی۔ وہ پھر اپنی چار دیواری میں پناہ لینے کے لیے خود کو آمادہ کر چکا تھا۔ جس سے پی کاک اور میں اسے جبراً نکال کر باہر کی ہوا میں سانس لینے کے لیے لے آئے تھے۔

بڑی ہی سنجیدگی سے مجھ سے مخاطب ہو کر پی کاک کہنے لگا۔

"میں نے کل ہی شام کو اس کا پہلا بوسہ لیا ہے"

"اور اسی بوسے کو آخری بوسہ سمجھ لو" مجیب نے اس کو چھیڑا۔

اس نے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے پھر ایک بار نئے اسٹیشن ماسٹر کا خط پڑھا۔ پھر مجھ سے کہنے لگا کہ خط اسے دے دوں۔

میں نے خط اس کو دے دیا، لیکن ساتھ ہی اصرار بھی کیا کہ صاف صاف

وہ بتاتا کیوں نہیں کہ اس خط سے وہ کیا کام لینے والا ہے اور اس کے دل میں آخر کس قسم کا شک و شبہ ہے۔

پی کاک اب بھی سنجیدہ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ تھام کر مجھ سے بڑی لجاجت سے معافی مانگی۔ اس کو دکھ اس بات کا تھا کہ موری کے شوہر نے میرے ابا کو خط لکھ کر میری پوزیشن خراب کر دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس پوری رومانی مہم میں میری اور مجیب کی شمولیت تو بس ایک حد تک تھی کہ جب پی کاک نے اپنی پروان چڑھتی ہوئی محبت کی باتیں کیں ہم نے ہنس ہنس کر سنا۔ جب اس نے مشورے لیے ہم نے الٹے سیدھے مشورے دیے اس کے ساتھ ہوئے تو کبھی کبھی موری کا دیدار بھی کر لیا ورنہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ اکیلا نہ ہوتا، تو موری اس کی سواگت کے لیے نہ دروازے تک آتی، نہ کھڑکی میں۔ پھر بھی مجھے پی کاک کی طبیعت کے کھلنڈرے پن سے اتنی توقع بھی نہ تھی کہ ابا کے آگے میری اس ہتک کو وہ اس قدر اہمیت دے گا

میرے ہاتھ تھام لینے پر اس کو جذباتیت کا شکار دیکھ کر میں نے بہت نرمی سے پوچھا کہ اب وہ اس خط کا آخر کیا کرے گا۔

اس نے بڑے شوق سے کہا:

"موری کو دکھلاؤں گا"

"کیا کرے گی بے چاری" میں نے موری سے ہمدردی کی۔

اب باقی کیا رکھا اس نے کرنے کو" اس کے شوہر نے لکھا ہے تاکہ اسٹیشن کو آدمی بھیج کر کسی موری نے ہمارے طواف کی اس کو اطلاع دی ہے۔

"عین ممکن ہے ۔ پہلے پہلے اس نے ایسا کیا ہو گا" عجب نے بھی حمایت کی۔

"اب تم نے کون سا تیر مار لیا ہے، جو اس حد تک خوش فہمی کے شکار ہو کر وہ تمہارے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی۔"

پی کاک کہنے لگا، "تم لوگوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ سچ مانو یار، تمہارے پی کاک کے انھیں ہونٹوں نے کل ہی رات اس کے ہونٹوں کا رس پیا ہے ـــــ میں کیا بتاؤں عجیب عورت ہے۔ جب میں نے اس کو باذوں میں لے کر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے سرد ہونٹوں پر رکھ دیئے تو وہ سر سے پیر تک بالکل ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس کے سارے وجود میں گرمی کا اگر کہیں مجھے کچھ احساس ہوا تو صرف اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں جو اس کی بند آنکھوں کے بوجھل پپوٹوں سے ڈھلک کر میری گالوں کو بھگو رہے تھے۔ برف کے ایک تودے سے گرم پانی کے بہنے کی روانی ـــــ وہ کیفیت صرف محسوس کی جا سکتی ہے کہی نہیں جا سکتی۔

ابّا باہر جانے کے لیے نکلے تو یکایک ہماری انجمن ناز درہم برہم ہو گئی۔ دلیپ نے جاتے ہی آہستہ سے مجھ سے کہا کہ آج ہی موری سے ملوں گا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اتیجے کی اوٹ سے گزر کر ابّا کی نظروں سے بچ نکلا، عجیب تو جیسے زمین میں گڑ کر رہ گیا۔ نہ پاؤں میں یارا تھا، نہ آنکھوں میں تاب نظارہ۔ قوت گویائی گویا سلب ہو چکی تھی۔ ابّا کے سامنے سے گزر جانے تک معلوم نہیں کتنی [illegible] مجیب پر ٹوٹ چکی تھیں۔ وہ چلے گئے تو میں نے سہارا دے کر

اسے کرسی پر بٹھایا۔ کچھ دیر بعد ہمارے جو اس بجا ہوئے، تو پی کاک کے اس طرح یکایک چلے جانے پر افسوس ہونے لگا۔ اس لیے بھی کہ آج وہ انکشافات کے موڈ میں تھا اور موہنی کی بے وفائی کا اتنا صدمہ اُسے ہوا تھا کہ وہ انتقاماً کسی راز کی پردہ داری کے لیے آمادہ نہ تھا۔

مجیب گردن جھکا کر اس طرح جدا ہوا جیسے خونِ دو عالم اس کی گردن پر ہی ہو۔

دو دن تک ان دونوں میں سے کوئی نہیں آیا اور میری شامیں تنہائیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

تیسرے دن کھڑی دوپہر کے وقت جبکہ ابّا دفتر میں تھے پی کاک بڑے ٹھسّے کا فل سوٹ پہنے مجھ سے ملنے آ دھمکا۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنی چاہی اور واقعی حقیقت بھی یہی تھی کہ ابّا مجھ سے بالکل ناراض نہ تھے اور نہ ہی میرے دوستوں سے۔ ہمارے ساتھ جو رویّہ انھوں نے اختیار کیا تھا، وہی ہماری سرزنش کے لیے کافی تھا اور وہ جانتے تھے کہ میرے لیے یہی بہت کچھ ہے۔

پی کاک نے وعدہ کیا کہ آج شام سے وہ برابر آئے گا اور مجیب کو بھی ساتھ لیتا آئے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان دونوں کے درمیان بھی وہ اور مجیب برابر ملتے رہے ہیں۔ یہ سُن کر مجھے اور بھی تکلیف ہوئی کہ میرے حصّے میں بے وجہ اداس اداس شامیں آئیں۔

آج اس قدر بن ٹھن کر نکلنے کا سبب میں نے پوچھا، تو پی کاک مسکرانے لگا۔

میرے اصرار پر اس نے کہا "بس ان دنوں تو بن ٹھن کر رہنے ہی کو
جی چاہتا ہے۔"

"آخر بتاؤ نا کچھ۔" میں نے بے تکلفی کے ناطے اپنے حقوق کا اظہار کیا۔

"اب تمہیں کیسے بتاؤں" وہ کہنے لگا، "کہ کوئی ہمارا منتظر ہے، کسی کی
آنکھ ہمارے لیے کرچھوٹ پر لگی ہیں؛ کوئی رات بھر ہمارے لیے کروٹیں بدلتا
رہتا ہے، کسی کی آنکھیں پو پھٹنے سے ہمارے انتظار میں نہیں جھپکتیں کسی کو
ہر آہٹ پر ہماری آمد کا گمان ہوتا ہے۔"

"لو بھئی چل دیے" اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے ہاتھ تھام کر کرسی پر اس کو ڈھکیل دیا "بہت موڈ میں ہو" میں
نے کہا "شاعری تو گھر کی باندی لگتی ہے۔"

لم ڈھڑنگ پی کاک اپنی ٹانگیں پھیلا کر اطمینان سے کرسی پر نیم دراز
ہو گیا۔ اس نے کوٹ کے بٹن بھی کھول لیے تو میں نے کہا، "ٹائی بھی ڈھیلی کر لو۔

وہ کہنے لگا "اتنا بھی نہیں ـــــ جو کچھ کیا ہے، وہی تمہاری دلبستگی
کی خاطر، ورنہ میرے پاس تو ان دنوں فالتو وقت بالکل نہیں ہے۔"

پی کاک کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مجھے اس کی کامرانی اور کامیابی کا اعتراف
کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"کیسی ہے مورنی"، میں نے گویا آغاز کر ہی دیا۔

وہ کرسی قریب گھسیٹ کر سیدھا ہو بیٹھا، اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو میری
طرف جھک گیا۔

"جس شام تم سے خط لے گیا ہوں، وہ ساری رات مورنی ہی کے بستر پر بسر کی ہے۔"

میں نے مذاق اڑایا۔ "ڈینگیں مت مارا کرو جی۔"

"اچھا جی،" وہ تن گیا۔ "یقین نہیں آتا ہے نا، چلتے وقت کان پکڑ کر پانی کی ٹنکی تک لے جاؤں گا۔ کر سکو گے ہمت؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تو بس،" اس نے بات جاری رکھی۔ "تمہیں ٹنکی کے نیچے کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ کر دیکھنا کس شان سے مورنی کے گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ دیکھنا کہ وہ کس خوشی سے وہ میرا سواگت کرتی ہے۔ دیکھنا کہ کس طرح اس کو اپنی باہوں میں لے کر چومتا ہوں۔ اپنا ذہنی توازن قائم رکھ سکو گے؟"

میں نے اثبات میں پھر سر ہلایا۔

"تو تم خط دکھا کر اس کی خبر لینے والے تھے" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں! رات بھر میں نے صرف پیار ہی نہیں کیا پہلے اس کی خبر لی، پھر خود اس کو آغوش میں لے لیا۔ تم کیا جانو، بیک وقت کس قدر سادہ بھی ہے وہ اور کس قدر پرکار بھی۔ اس کی کیا کیا تعریف کروں، جسم تو یوں سمجھو جیسے رات بھر بستر پر بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ ناگن کی طرح بل کھاتی ہے۔ لیکن ڈسنا جانتی ہی نہیں۔ جب چاہو ممولے کی طرح مٹھی میں بند کر کے سینے میں چھپا لو۔ مورنی کے حسن سے اس کے چیختے اور پکارتے ہوئے بدن سے اس کی سرد اور یخ بستہ روح کو جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ تم نے لپکتے ہوئے شعلوں اور گرتی ہوئی برف کا اتصال کبھی دیکھا ہے؟ میں نے جب کبھی اس کا قرب چاہا۔ میں

نے جب بھی اس کے وجود کو اپنے وجود میں ضم کر لینا چاہا، مجھے ایسا لگا کہ شعلے برف پر لپک رہے ہیں۔ اس نے جب اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا تو صرف اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی حرارت تھی۔ جو مجھے گرمی کا احساس دلا رہی تھی۔ انگارے برف پر گرتے رہیں بھی تو کیا حاصل۔ برف جل اٹھنے سے تو رہی۔ انگارے خود ہی جل کر بجھیں گے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا اور میں سرد پڑ گیا۔ سنتا تھا کہ عورت کبھی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ میں آج بھی اس بات کو نہیں مانتا ہوں لیکن اس وقت موروثی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں اس کو چھوڑ کر جب اس سے الگ ہو گیا، تو اپنی فتح پر ندامت کا احساس غالب تھا۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر کہنے لگا "موروثی تو پھلوں سے لدی ہوئی وہ شاخ تھی جس نے خود جھک کر مجھے پھل توڑ لینے کے لیے اکسایا اور جب ہاتھ بڑھا کر میں نے اپنی مضبوط گرفت میں اس ٹہنی کے سرے کو تھام لیا تو پھلوں اور شاخ پر برف ہی برف جمی ہوئی تھی، جو کچھ ایسی منجمد تھی کہ نہ پگھلتی تھی، نہ پانی بن کر بہتی تھی۔"

"وہ دیر تک اپنی ہچکیوں کو دباتی رہی۔ میں بے بس سا اس کے سرہانے بیٹھا ہوا اس کی لمبی سیاہ زلفوں میں اپنی انگلیاں پھیرتا رہا۔ وہ اٹھ بیٹھی تو اپنا شانہ گھونٹتا رہا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ عورت جس کے انداز سپردگی نے میری رگ رگ میں آتش سیال دوڑا دی تھی، اپنا سب کچھ تج دینے تک کڑکڑاتی سردیوں کی رات میں پڑی ہوئی پتھر کی سل کس طرح بن گئی تھی۔

موروثی تک میں تو یہ سمجھ کر بڑھ آیا تھا کہ اس کی تشنگی کی تسکین کا باعث

بنوں گا۔ لیکن تشنگی کیا مورلی کے پاس تو دور دور تک کسی جنسی جذبے کا گزر نہ تھا، وہ تو سرد رات کا اوس میں بھیگا ہوا پتھر تھی، وہ برف کی ایک سِل تھی جس کے اطراف میں نے آگ جلانے کی کوشش کی تھی۔

وہ کچھ سنبھلی، تو میں نے اس کو پکارا، مورلی! تم کیا ہو۔ کہاں ہو اور یہ سب کچھ آخر کیوں ہے۔ مجھے لگا کہ میری ہی آواز میں، مجھے خود میں، نہیں کوئی اور پکار رہا ہے۔ کبھی قریب سے، کبھی اتنی دور سے کہ آواز پہچانی نہیں جا رہی۔

وہ جب کچھ نارمل ہو گئی، تو میں نے اس کے کپڑے اپنے ہی ہاتھوں سے درست کیے۔ بالکل اس طرح جیسے پتھر سے ترشی ہوئی حسین عورت کے اسٹیچو کو میں کپڑوں "ریلیپٹ کر چھپا رہا ہوں کہ کہیں میرا جذبۂ حیوانی اپنے ہی احساسات" کی جراحت نہ بن جائے۔

"میں نے کتنی ہی اِدھر اُدھر کی باتیں اس سے کیں۔ طرح طرح سے اس کا دل بہلایا۔ بس میری خواہش یہی تھی کہ وہ صرف ایک بار مسکرا دے۔ تاکہ اس کی اس مسکراہٹ کے سہارے میں اس راز تک پہنچ سکوں جس پر اس کے آنسوؤں نے کتنے ہی دبیز پردے ڈال دیے تھے۔"

"آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی اور اس کے بعد پھر میں نے اس سے قرب کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جماہیاں لینے لگی۔ تو میں نے بڑے چاؤ سے سہارا دے کر اس کو سینے سے لگا لیا اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس کے رخساروں سے چپٹے ہوئے ان چند بالوں کو برابر کرنے لگا، جو خشک آنسوؤں کے سہارے اس کے تمتماتے گالوں پر سیاہ لکیریں بن گئے تھے۔

میری انگلیاں اس کے شانوں پر گردن کے قریب پہنچیں تو اس کو گدگدی ہوئی اور وہ یکایک پھلجھڑی کی طرح مسکرا اٹھی، میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اس کو پھر گدگدایا، وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ میں اس کو پھر گدگدا کر بستر پر ٹوٹتی ہوئی بجلیوں کا سماں دیکھا۔ جب میری آنکھیں چندھیانے لگی تو میرا جی چاہا کہ پتھر کے اسٹیچو کے خوبصورت جسم سے وہ کپڑے اتار دوں جن سے میں نے ابھی ابھی اس کو ڈھک دیا تھا۔ اس لیے کہ یہ اسٹیچو اب سانس لے رہا تھا۔

"موری ۔۔۔ میں اس کو اسی نام سے پکارتا ہوں۔ مجھے معاف کردو، یا پھر میری سمجھ میں آجاؤ موری ۔۔۔ تم ایک معمہ بن گئی ہو جس کے آڑے اور کھڑے اشارے نہ کہیں ملتے ہیں، نہ کوئی لفظ وجود میں آتا ہے۔ میری اس التجا کو بڑی غور سے سن کر وہ مسکرائی۔"

پھر مسکرا کر اس نے کہا "اب سمجھ سکتے ہو مجھے"؟

"ہاں" ۔۔۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آنسو تم مردوں کی سمجھ میں نہیں آتے ۔۔۔ بس یہی بات ہے نا؟"

میں لاجواب ہو کر بس ٹکر ٹکر اس کو دیکھتا رہا۔

"مجھے بچّہ چاہیے" اور بجلی کی طرح کروٹ لے کر اس نے اپنا چہرہ میری آغوش میں چھپا لیا۔

"تو پھر اس میں رونے کی کیا بات تھی۔" میں نے اس کا ہاتھ چومتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ دیر چھت کو تکتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔ میرا آنگن سونا ہے اور اسی لیے

لیے تو میں اپنے بچّے کی تلاش میں یہاں تک چلی آئی ہوں کہ تمھارا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ سکوں۔ زندگی ویسے بھی گزر سکتی تھی۔ بنجر دھرتی کا دکھوالا اگر اس کے بنجر ہونے پر ہی خوش ہو تو دھرتی کا کیا جاتا ہے۔ لیکن عورت شاید تخلیق کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ بیوی اور بہن پکاری جانے والی تمھاری مورنی کوئی آٹھ سال سے ماں پکارے جانے کے لیے ترس رہی ہے۔

"اب شاید تمھارے سمجھ میں آگئی ہوں گی"

"آ نہیں گئی ہو۔ کچھ کچھ آرہی ہو۔"

میرے آنسو صرف اس لیے تھے کہ آنے والے مہمان کی آمد کی امید میں، میں نے کتنی بڑی قیمت ادا کر دی ہے۔

"تمھاری مورنی کو اس کی بدنصیبی نے تمھاری آغوش میں پھینک دیا ہے، پی کاک۔ مجھے معاف کر دو میں یہی ساری اوٹ پٹانگ باتیں سوچ سوچ کر باولی ہوتی رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اتنے بڑے سارے آنسو تنہائی میں جی کھول کر رو لینے کے باوجود میری آنکھوں میں کیسے بچ رہے ہیں۔"

مجھے محسوس ہوا کہ میں بجھ رہا ہوں۔

لیکن خوبصورت عورت کا اسٹیچو، جو سانس لینے لگا تھا، اب زندہ ہو چکا تھا۔

مجھے بچہ دو گے نا — سمکتا ہوا، کلکتا ہوا۔ اتنا سا، ننھا۔

پھر مورنی کا خوبصورت اور گرم جسم رات بھر صرف میرے لیے تھا اور اس کی روح پتہ نہیں اپنے شوہر کے پاس تھی جو اسٹیشن پر نائٹ ڈیوٹی کرتا ہوا اپنے

جانے والے مسافروں کی حفاظت کر رہا تھا یا اس مہمان کے پاس جس کے انتظار میں
مورنی کا آنگن سونا ہے، اس کی روح پیاسی ہے۔
میں پی کاک کی باتیں اس طرح سنتا رہا جیسے مجھے سانپ سونگھ گیا ہو۔ پی
کاک واقعی بہت متاثر تھا۔ میں نے بھی اپنے تاثر کو دانستہ طور پر چھپاتے ہوئے
پی کاک کو چھیڑا۔
" تو تم اس کی مجبوری اور کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے اب وہیں جا
رہے ہو "
" پی کاک، ایسا ہی کھلنڈرا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اس پر طنز کر رہا ہوں "
کہنے لگا۔ "جی کیا اب آپ اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں "
"کیا تم نے مورنی کے شوہر سے مل کر باضابطہ اجازت لے لی ہے جو اس
قدر ڈھیٹ ہو گئے ہو کہ دن اور رات دونوں تمھارے ہیں۔
" اب تو اس کو مجھ سے اجازت لینی پڑے گی "
میں ہنس پڑا۔
پی کاک نے بتایا کہ مورنی کا شوہر سرکاری کام سے اپنے ہیڈ آفس گیا
ہوا ہے اور ابھی کوئی تین روز تک اسی کی حکمرانی ہے۔
" تمھیں یاد ہے کہ میں نے تم سے کیا پوچھا تھا اور جواب میں تم نے اصل
بات تو گول کر دی۔ بس لگے اپنے معاشقے کی داستان سنانے "
وہ سوچنے لگا۔
میں نے پھر یاد دلایا کہ مورنی کے شوہر کا خط پڑھ کر جس برہمی کا تم نے اظہار

کیا تھا، وہ شاید اسی روز پیار میں بدل گئی۔

سچ کہا" اس نے قہقہہ لگا کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے مصافحہ کیا، تو اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے ہوئے اتنا کہا:

"مورنی کہتی تھی کہ میرا شوہر اب حد درجہ مطمئن ہو گیا ہے۔ میں نے ہی اس کو اکسا کر یہ خط لکھوایا ہے۔ ورنہ وہ ہیڈ آفس جانے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔"

"بڑی چالاک اور پرفن معلوم ہوتی ہے تمہاری مورنی"۔ میں نے کہا۔

"اتنی ہی معصوم بھی" ــــــ اس نے اضافہ کیا۔

معصومیت تو اس پوری روداد میں کہیں نہیں جھلکتی" میں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"تم جلنے لگے ہو یار اس سے"

اس طرح پی کاک نے میرا پتہ کاٹا اور ہاتھ چھڑا کر چلتا بنا، جس کو میں ابھی تک تھامے ہوئے تھا۔

شام کو عجیب مجھ سے ملنے آیا تو ہم دونوں صرف پی کاک اور مورنی کی باتیں کرتے رہے۔ گھومنے کے لیے نکلے، تو دلوں کے چور نے پانی کی ٹنکی کے نیچے تک جیسے راہ نمائی کی۔ مورنی کی کھڑکی کی طرف نظریں اٹھیں، تو پی کاک آئینے کے سامنے کھڑا مانگ نکال رہا تھا۔ اس نے ہم کو دیکھا تو ہاتھ سے ٹھہرنے کے لیے اشارہ کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہمارے پاس آ پہنچا۔

عجیب نے کہا ہمیں ملاؤ نا اپنی مورنی سے۔

"کیا کرو گے مل کر۔ مجھ سے کوئی دشمنی کرنی چاہتے ہو۔ وہ تو تم لوگوں

کو یہاں دیکھ بھی لے تو مجھ سے خفا ہو جائے گی۔ اس کا حکم ہے کہ یہ راز سوائے اس کے اور میرے کسی کو معلوم نہ ہو۔ وہ نہانے کے لیے باتھ روم میں گئی ہوئی ہے۔ سج دھج کر بناؤ سنگھار کر کے نکلے گی تاکہ رات مجھے قتل کر سکے۔ اچھا جاؤ اب یہاں مت ٹھہرو، ورنہ مجھے تمہارے بزرگوں کو خط لکھنا پڑے گا کہ میری معشوقہ پر ڈورے ڈال رہے ہو۔"

"اچھا جی۔"

ہم تینوں نے قہقہہ لگایا۔۔۔ اور وہ مزید کچھ کہے سُنے بغیر ہاتھ کے اشارے سے گڈ بائی کہتا ہوا مورنی کے گھر کی طرف لوٹ گیا۔

واقعی پی کاک پر ہمیں رشک آرہا تھا۔

مجیب کہنے لگا "حرام زادہ بہت مزے کر رہا ہے۔ ایسی کی تیسی"
یہ بات اس نے اس طرح کہی جیسے کہنا چاہتا ہو کہ آج میں بھی تصویر میں گھسیٹ لوں گا اس کی معشوقہ کو ۔۔۔ رات بھر نہیں چھوڑوں گا۔

کالج کھل گئے تو میں اور مجیب شہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ پی کاک کتابوں کا کیڑا تھا۔ ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتا، اس سال تو وہ امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوا تھا۔ وہ چونکہ شہر جانے والا تھا اس لیے اس کے والد اس کو وداع کرنے کے لیے اپنے مستقر سے رخصت پر دوھان پور آئے تھے ہم اسٹیشن پہونچے تو خلافِ امید وہ بھی اپنا سوٹ کیس سنبھالے موجود تھا۔ ہمیں اچنبھا ضرور ہوا لیکن سوائے خاموشی کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کے والد بھی اس کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ جب گاڑی چلنے لگی

اور پانی کی ٹنکی کے قریب پہنچی تو اس نے کھلے دروازے میں کھڑے ہو کر اپنے لمبے لمبے ہاتھ ہلائے۔ مورنی نے نھی کو اڑ کی اوٹ سے ہاتھ ہلا کر اس کو وداع کیا۔ جب ٹرین فرّاٹے بھرنے لگی، تو پی کاک نے اپنا سوٹ کیس برتھ پر سے اتار لیا اور دروازہ بھیڑ کر ہمارے پاس برتھ پر آ بیٹھا۔

میں نے سوٹ کیس دروازے کے پاس رکھنے کا سبب پوچھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا آنے والے اسٹیشن پر گاڑی بہت کم ٹھہرتی ہے۔

مجھے شاید اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ دوسری گاڑی سے جو دھان پور کی طرف جاتی ہے پی کاک لوٹ جانے والا تھا۔

لیکن مجیب نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"تمہیں آنے والے اسٹیشن سے کیا تعلق"؟

"جو تعلق مسافر کو منزل سے ہو سکتا ہے"

"تو پھر تم اپنی منزل پیچھے چھوڑ کر یہاں تک کیوں چلے آئے"

"واپس لوٹنے کے لیے مدھو رام ــــ پتا جی کی خاطر یہاں تک آیا ہوں۔ مورنی کی خاطر لوٹ جاؤں گا۔ زندگی کے چند حسین ترین لمحے ساری زندگی سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ میری قسمت میں تو مکمل ایک دن اور ایک ساری رات باقی ہے۔ تم میری خوش نصیبی کا تو اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ میں جب چلا تھا تو مورنی بے چین تھی۔ اب وہ مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئی ہے۔ میں نے برف کی سل کا سینہ چیر کر انگارے رکھ دیئے ہیں اور اب لپکتے ہوئے شعلوں کا سماں دیکھ رہا ہوں"

پھر وہ مسلسل موری کی باتیں کرتا رہا۔
اسٹیشن آیا تو پی کاک نے دوسرے دن کالج میں ملنے کا وعدہ کیا اور اتر گیا۔
کالج کی ہما ہمی نے موری کو ہمارے ذہنوں سے آہستہ آہستہ محو کر دیا۔ پی کاک دوسرے دن لوٹ تو آیا لیکن کوئی چار پانچ دن تک ہم سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ سائنس کالج کا طالب علم تھا اس لیے ہم روزانہ کم ہی ملتے تھے۔ ہمارے آرٹس کالج میں اور اس کے کالج کے درمیان فاصلہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ ہاں جب کبھی پی کاک سے ملاقات ہو جاتی اس کے نام کی مناسبت سے موری کا خیال بھی ضرور آجاتا۔ یوں بھی موری سے ہماری ذہنی یگانگت کی کوئی وجہ بھی نہ تھی، جو وہ ہمیں دنوں تک یاد رہتی۔ وہ جو کچھ تھی پی کاک کے لیے تھی اور پتہ نہیں پی کاک نے کس کس طرح اس کو اپنے خیالوں میں بسا رکھا تھا۔
دن گزرتے گئے اور پی کاک کو ہماری ہی طرح زیادہ دوستوں نے اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ بعضوں نے پہلے پہل وجہ تسمیہ جاننے کی کوشش کی پھر بھی بجان کہ مطمئن ہو گئے کہ ہم چاؤ میں دیوی سنگھ کو پی کاک پکارتے ہیں۔ اب وہ اتنی زبانوں سے پی کاک پکارا جاتا کہ دوستوں میں اس کالج کا نام پڑ گیا اور اب پی کاک ملتا بھی تو موری نیا دنہ آتی۔
ہاں پی کاک سے میں تنہا ملتا اور کوئی دوسرا نہ ہوتا، تو وہ ضرور موری کو یاد کر لیتا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ یادیں بھی گھڑی کی وہ ٹک ٹک بن کر رہ گئیں جن پر کبھی ہم نے کبھی دھیان دیا تھا اور آج جو وقت کے قدموں کی ایک ایسی چاپ

ہو کر رہ گئی تھیں، جس کو شاید ہم سنتے بھی نہ تھے۔

ایک رات اپنی ہاکی ٹیم کے ہار جانے پر میں بڑا مغموم تھا۔ دوسرے سال کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں۔ اس سال بھی شیلڈ ہمارے کالج کو ملتا تو ہم کھلاڑیوں کی تعطیلات کا بڑا حصہ اس خوشی میں کشمیر کی سیر و تفریح میں گزرنے والا تھا۔ ابا کا تبادلہ ددھان پور سے ہو چکا تھا۔ میں ان کے نئے مستقر پہ چھٹیاں گزارنے کے تصور سے یوں بھی اداس تھا کہ وہاں کوئی میرا دوست نہ تھا۔ پی کاک اور مجیب پھر ددھان پور میں ایک جا ہونے والے تھے۔ جی اچاٹ اچاٹ سا ہو گیا تھا۔

میں نے کمرے پر تالا ڈال کر باہر جانے کا قصد کیا۔ سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ پی کاک تیز تیز سیڑھیاں چڑھتا ہوا میرے برابر سے گزر گیا۔ اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑی بھی نہیں۔ میں نے آواز دے کر اسے روکا۔ وہ پلٹ کر دو ہی جست میں مجھ تک آ پہنچا۔ اس کا عالم دیدنی تھا۔ وہ اس قدر عجلت میں تھا جیسے چاہتا ہو کہ پھر ایک بار گھڑی کی ہر ٹک ٹک کو اپنے قبضے و دسترس میں لے لے اور اڑتے ہوئے لمحے اس کے حضور مجسم ہو کر دست بستہ ہو جائیں۔

"مدد کرے گا میری؟"

"کیا افتاد پڑی ہے آخر؟"

"موری میرے ساتھ ہے۔ میں اس کو باہر ٹیکسی میں بٹھا آیا ہوں۔ وہ اس گاڑی سے اپنے نئے مستقر جا رہی ہے۔ اس کا شوہر وہیں ہے ——— ددھان پور سے اس کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے چلی آئی ہے۔"

"تم چاہتے کیا ہو" میں نے اس کی بے ربط باتیں سُن کر پوچھا۔
"ٹرین ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے ۔ میں اس کو یہاں لے آیا ہوں کہ تمہارے کمرے میں سکون اور اطمینان سے جی بھر کر باتیں کروں ۔ تمہارا سنگل روم ہے ورنہ میں اسے اپنے ہاسٹل لے جاتا۔"
ایک ہی سانس میں وہ ساری باتیں کہہ گیا۔
ہوسٹل انچارج راؤنڈ لے کر جا چکا تھا۔ اس لیے میں نے حامی بھر لی اور اپنی چابی اس کے حوالے کر دی۔
میرا ہاتھ پکڑ کر وہ مجھے بھی موٹر تک لے گیا ــــ پھر خود ہی کچھ سوچ کر مجھے کچھ دور ہٹ جانے کے لیے کہا۔
موری موٹر سے اتری تو میں اچھی طرح اس کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا حُسن اور نکھر آیا تھا۔ اس کے سینے سے ایک چھوٹا سا صحت مند اور توانا بچّہ چمٹا ہوا ہے ۔ جس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مجھے دکھائی دے رہے تھے ۔ میرے ذہن میں ریزہ ریزہ یادوں کی کتنی ہی کرچیاں کھٹک رہی تھیں ۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ پی کاک نے موری کی گود ہری ہونے کی بات مجھے کیوں نہیں بتائی ۔ آج اتفاقیہ طور پر یہ سب کچھ میرے سامنے نہ آجاتا تو گویا اس جیتی جاگتی کہانی کا خاتمہ ایک ایسے موڑ پر ہو جاتا جہاں صرف گھپ اندھیرا ہوتا ایسا اندھیرا جہاں آنکھوں کا تو کیا ذکر دل بھی دل کو نہیں دیکھ سکتا ہو۔
پی کاک نے بچّے کو موری کی گود سے لے لیا اور اشارے سے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا۔

اور اس سے پہلے کہ میں کبھی اشارتاً اس سے یہ کہتا کہ ہاں میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر چاٹ چاٹ بچے کو چومنے لگا۔

کاش میں اس وقت مورنی کے اتنا قریب ہوتا کہ اس کے چہرے پر ماتا کی ریکھائیں پڑھ سکتا اور انھیں ریکھاؤں میں کسی چھپے ہوئے درد کی پرچھائیاں بھی مجھے نظر آئیں۔

میں تو مورنی سے اتنے فاصلے پر تھا کہ مجھے اس کے چہرے پر صرف شگفتن گل ہائے ناز کا سماں نظر آ رہا تھا وہ کانٹے جو کھلتی ہوئی کلیوں کی پنکھڑیوں کو جراحتیں بخش رہے تھے؛ میری نظروں سے بالکل چھپے ہوئے تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں مورنی سے قریب ہوتا تو مجھے ان کانٹوں کی جراحتیں اس کے چہرے پر ضرور نظر آتیں۔

میں کچھ اور بھی اداس ہو گیا۔ درآں حالیکہ اس اداسی کی کوئی اساس نہ تھی۔

ادھر ادھر بے مقصد گھوم پھر کر میں اپنے کمرے پر لوٹا، تو پی کاک، مورنی اور ان کا بچہ ابھی وہیں تھے۔ میں لوٹنے لگا تو دبی دبی سسکیوں نے گویا میرا راستہ روک لیا۔ میں اپنے پر جبر کر کے آگے بڑھ آیا۔ لیکن سسکیاں برابر میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں نے قدم تیز کیے ہی تھے کہ پیچھے سے جھپٹ کر پی کاک نے مجھے روک لیا۔

وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔

"گاڑی کا وقت ہو رہا ہے" وہ کہنے لگا "ٹیکسی لے آؤ گے؟"

"جی "۔۔۔ میں نے کہا "ضرور لے آؤں گا۔ لیکن کیا تم موری کو اس عالم میں جدا کر دو گے"؟

"جی نہیں، رات یہیں بسر کروں گا تاکہ ہوٹل سے کل آپ کا سفر کالا کر دا سکوں"۔

مجھے اپنے سوال کے بے معنی ہونے کا احساس ہوا لیکن میرا سوال بے معنی بھی تو نہیں تھا۔ وہ تو پی کاک نے تو اس کو ایسے معنی پہنا دیے تھے۔

ٹیکسی میں سوار ہونے کے لیے موری کمرے سے نکلی تو ننھا پی کاک کی گود میں تھا۔ اس نے قریب لا کر مجھے ننھے کو دکھلایا۔ واقعی یہ تو چھوٹا سا پی کاک تھا۔

موری کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر اب کہیں شگفتگیِ گل ہائے ناز کا وہ سماں تھا ہی نہیں جو میں نے موٹر سے اترتے وقت دیکھا تھا۔ اب تو مجھے صرف جراحتیں نظر آرہی تھیں، جو ایک جا ہو کر ایک عورت کا چہرہ بن گئی تھی۔

پی کاک، موری کے برابر بیٹھ گیا تو موٹر روانہ ہو گیا۔ ہاتھ پھیلا کر موری نے ننھے کو پی کاک کی آغوش سے کب لے لیا، میں یہ بھی تو نہ دیکھ سکا۔

مجھے یقین تھا کہ پی کاک لوٹ کر پھر میرے کمرے میں آئے گا چنانچہ یہی ہوا۔

وہ لوٹا تو کچھ اداس اداس تھا۔

میرے دماغ میں وہ سسکیاں ابھی تک گونج رہی تھیں، جو ابھی ابھی

میں نے سنی تھیں۔ وہ گم سم بیٹھا رہا تو میں نے موربی کے اس قدر اداس واپس لوٹنے کا سبب پوچھا۔

پی کاک، ہاں کر کے اس طرح ٹالتا رہا جیسے کوئی بات شروع کرنا چاہتا ہو، لیکن سجھائی نہ دے رہا ہو کہ شروع کس طرح کی جائے۔

میں بھی خاموش ہو رہا۔ پھر اس نے خود کہا

"میں نے اس سے زیادتی کی یار۔"

میں اس وقت بھی خاموش رہا۔ میں تاڑ گیا تھا اسے اب وہ خود ہی سب کچھ بتا دینا چاہتا ہے تاکہ اس دکھ کی گراں باری سے نجات پا سکے، جس کا بوجھ وہ اپنے سینے پر محسوس کر رہا ہے۔

"واقعی میں نے اس سے زیادتی کی یار"

"لیکن جاتے سمے اس نے میرے پیر چھو لیے۔ میرے پاؤں کی خاک اپنی پیشانی پر لگا لی۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور باز رکھنے کی کوشش کی، تو اس نے مجھ سے کہا تمہیں اس امانت کی سوگند ہے، اگر تم نے مجھے معاف نہیں کیا اور اس نے ننھے کے لیے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیے۔ میں نے جب یہ ننھی سی امانت اس کو سونپ دی تو اس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اپنے سارے وجود کو مجھ پر نچھاور کر رہی ہو۔"

"میری نظریں خود بخود جھک گئیں۔"

"میری نظریں، جو اس کی تقدیس کے آگے پشیمان تھیں۔"

وہ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں سمجھ گیا کہ

وہ مجھے نہیں دیکھ رہا ہے۔

پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم ان کی سسکیوں کا سبب جان گئے ہونا جو تم نے سنی تھیں"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

لیکن پی کاک کی تشفی نہ ہوئی "کیا سمجھے تم؟" وہ پوچھ بیٹھا۔

یہی کہ مورنی کا وہ جسم جو تمہارے لیے سب کچھ تھا، مورنی کی سسکیوں نے اس کی روح چھین کر تمہیں دے دی اور تم اس کے جسم تک نہ پہنچ سکو گے۔

"بالکل ٹھیک" وہ کہنے لگا "عجیب عورت ہے یار"

وہ صرف ماں ہی ماں نظر آتی ہے"

اس نے اپنی جیب سے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکال کر میرے آگے بڑھا دی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھا۔

مورنی، ننھے پر جھکی اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی رعنائیاں صرف ماتاپن کر رہ گئی تھیں۔

میں نے فون ٹن پن کھول کر تصویر کے نیچے "ماں" لکھا اور پی کاک کو لوٹا دی۔

اس نے مجھ سے فون ٹن پن مانگا۔ میں نے دے دیا تو اس نے بھی کچھ لکھا۔ میں نے دیکھا، اس نے بھی ایک چھوٹی سی لکیر کھینچ کر پھر "ماں" لکھ دیا تھا۔

شیبا

بند کمرے کے دریچے کھلنے لگے اور ہوا کے تازہ جھونکے ماضی کی ساری یادیں سمیٹے ہوئے اس کے نہاں خانۂ دل میں در آئے۔ میں اس کے مقابل بیٹھا ہوا اس کی شخصیت کی شفاف سطح کو کھردرا ہوتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

وہ حسرتیں اور محرومیاں جو اس کے مزاج کی سنجیدگی بن گئی تھیں بڑھتے بڑھتے اب اس کا مزاج ہی بن بیٹھیں، اس طرح کہ خود اسے بھی ان حسرتوں کے سہارے اس قدر دور نکل آنے کا کوئی احساس تک نہیں ہوا۔

میں اپنی رجمنٹ میں سب سے کم عمر فوجی افسر تھا۔

اس نے فرج میں رکھی ہوئی ٹھنڈی بیئر کی دوسری بوتل اٹھائی اور اس پر اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ پھر بڑے چاؤ سے اس نے اس بوتل سے اپنے گال لگا دیئے

پھر بڑی احتیاط سے بوتل کھول کر مگ بھرا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

اپنی بھولی بسری یادوں کی گٹھری اس نے کھول کر میرے سامنے جیسے بچھا دی۔ میں نے اس گٹھری میں سے گرد میں اٹی ہوئی فوجی وردی اٹھائی اور جھاڑ جھٹک کر جیسے اس کی طرف بڑھا دی اور پلک جھپکتے اس نے یہی وردی زیب تن کر لی اور بڑی گمبھیرتا اور بانکپن کے ساتھ میرے مقابل بیٹھا مسکرانے لگا۔

فرج میں رکھی ہوئی بیئر کی پہلی ٹھنڈی بوتل ختم کر کے جب وہ دوسری بوتل اٹھاتا تو میں اس فوجی افسر کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو جاتا جو مسعود الرحمان زیدی کی تہہ در تہہ شخصیت میں اس طرح چھپا رہتا جیسے منوں مٹی کے نیچے ایک مردہ ذہن، ایک مردہ دماغ، ایک مردہ دل جو بجائے خود کبھی ایک چلتی پھرتی دنیا رہا ہو گا، ایک چلتا پھرتا عالم کا عالم۔

وہ اپنا مگ میز پر رکھ کر اس میں پڑی ہوئی ٹھنڈی بیئر کو آنکھوں سے پیتا رہا۔ پھر کہنے لگتا۔

"میں اپنی رجمنٹ میں سب سے کم عمر فوجی افسر تھا۔

"ایک انگریز میجر نے مجھ سے اور میرے ساتھی گرمیت سنگھ سے ایک بار اہانت آمیز سلوک کیا تھا۔ میں نے اپنا پسٹل گورے میجر کے سینے پر تان دیا تھا لیکن گرمیت سنگھ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ پسٹل فائر ہوا اور گولی زمین کے سینے میں دھنس گئی۔ ورنہ بلڈی باسٹرڈ (BLOODY BASTARD) کے پرخچے اڑ جاتے۔ اور تمھیں پتہ ہے یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ صرف میری شیبا کے لیے۔ شیبا جس نے زندگی کی صعوبتوں میں میرا ساتھ دیا۔ شیبا جو ہر صبح

سے شام تک سنگاپور میں جاپانیوں کی قید سے میری رہائی کی منتظر رہی۔ میری شیبا کی اس کمینے انگریز میجر نے بے حرمتی کی تھی۔ بڑی تذلیل کی تھی اس کی۔ اتنی کہ خود اس کی قوم کے سپاہیوں نے اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور — ہاں، واقعی قصور میری شیبا کا بالکل نہیں تھا۔"

اس کی زبان دوسری بوتل کے آغاز پر قینچی کی طرح حسب دستور چل رہی تھی۔

"کون تھی یہ شیبا — نام بڑا خوبصورت ہے۔" میں نے پوچھا۔

"شیبا — شی — یا — شی — با۔" معسود نے دو ایک بار اسی طرح اس کا نام لیا۔ پھر — کہنے لگا۔ "میری کتیا، وفادار جانور — میری ڈارلنگ۔" میں اسے بس دیکھتا رہ گیا۔ میں نے ایک صدف کا سینہ اس لیے وا کیا تھا کہ اس میں سے ایک دُرِ سفتہ نکل آئے گا — ایک گوہر نایاب — لیکن شیبا تو کتیا نکلی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس غلط فہمی کا شکار رہوں کہ شیبا تو ایک حسین و جمیل لڑکی ہے۔ ایک چلتا پھرتا جادو ہے۔ زندگی کی صعوبتوں میں امید کی کرن ہے۔ دل کی تاریکیوں میں موم بتی کا ننھا سا اجالا ہے۔ سرتاپا ایک ایسے حسن کا جیتا جاگتا وجود ہے۔ جس کے ہونٹوں سے ہونٹ ملا کر معسود اپنی اس زندگی کو بھول جاتا ہو گا جو ہر لمحہ موت سے نبرد آزما ہو جاتی تھی —

میرا جی اب بھی یہی چاہا کہ اپنی چہیتی کو کتیا اور وفادار جانور کے نام سے

یاد کرنے کے اس انداز کو مسعود کی کوئی فوجی ادا سمجھوں ــــ لیکن نہیں ــــ شیبا تو واقعی کتیا نکلی۔

"تو تم ایک جانور کے لیے ایک آدمی کی جان کے درپے ہو گئے تھے۔"

"بالکل نہیں ــــ میں تو ایک عظیم عورت کے لیے ایک حیوان کی جان کے درپے ہو گیا تھا"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"سب کچھ ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"شیبا جانور تھی تو کیا ہوا۔ شیبا کے اوصاف میں نے کم انسانوں میں دیکھے ہیں بلکہ کم عورتوں میں۔" اور اس نے بیر کا مگ منہ سے لگاتے ہوئے کنکھیوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو کچھ ہی دور پر میری بیوی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

"تم یقین کرو شیبا میری دوست تھی، میری ہمدرد، وہ ایک بہن تھی ایک ماں۔"

کیا بکتے ہو؟"

"سچ کہتا ہوں ــــ تم شیبا کے دل تک کہاں پہنچ سکے ہو۔ صبر کرو میں تمہیں سب بتا دوں گا کہ وہ کیا تھی۔ میں اُسے کیا سمجھتا تھا۔

"لیکن اس سور کے بچے نے اس ملڈی باسٹرڈ گورے میجر نے اسکے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔"

ــــ وہ کہتا گیا۔۔۔

ہم نے جاپانیوں کے آگے ابھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ بارڈر پر کھدی ہوئی خندقوں کے اطراف پزیشن لے کر ہی ہم نے مہینوں گزار دیے ــــ نہ ہمیں پہل کرنے کا آرڈر ملا تھا۔ نہ جاپانی ہی حملہ کرتے تھے۔ زندگی ایک عجیب سی بے دلی کا نام ہو گئی تھی ــ ایک ایسی کیفیت کا نام جو اپنے کسی جیالے کے کفن پھاڑے جانے کی آواز سن کر ہوتی ہے۔ حالانکہ کسی بھی لباس کے لیے کپڑا پھاڑا جائے تو آواز مختلف نہیں ہوتی۔ بالکل وہی آواز ہوتی ہے ــــ لیکن ــــ بس کچھ یہی حال زندگی کا تھا ــــ سب کچھ وہی تھا، وہی زمین، وہی آسمان، وہی چاند، وہی ستارے، وہی ان کی ٹھنڈک، وہی سورج، وہی اس کی تمازت، وہی صبح، وہی شام، لیکن پھٹتے ہوئے کپڑے کی آواز کا تاثر بدل گیا تھا ــــ پھر یہی تاثر جیسے تھم کر، ٹھہر کر مستقل طور پر زندگی بن گیا تھا۔

"خوب رو لینے سے آدمی کا دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن رو لینا بس میں بھی تو ہو ــــ کیا یہ کوئی مذاق ہے ــــ اور شیبا زندگی کے اسی دور میں مجھ سے ملی جب کہ آنسو میرے بس میں نہیں تھے۔ میں تو یہ بھی نہ جانتا تھا کہ اگر یہ زندگی ہے تو موت کیا ہے ــــ موت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔

"موت اور زندگی کے اسی دوراہے پر شیبا مجھ سے ملی ــ بھوکی شیبا جس کو میں نے اپنے راشن میں سے برابر کا حصہ دار بنا لیا۔ پھر وہ میری دوست ہو گئی ــــ میری غمخوار ــــ جہاں کوئی کسی کو نہیں دیکھتا ہو وہاں

کسی بھی ذی روح کا اپنی ذات میں دلچسپی لینا ـ چاؤ اور چاہت سے پیش آنا کتنی بڑی دولت ہوتی ہے اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے ـ وہاں یہ تفریق مٹ جاتی ہے کہ تمہیں چاہنے والا کوئی انسان نہیں ہے جانور ہے ـ

" تم نے زندگی کے وہ منظر دیکھے ہی نہیں ، جہاں آدمی اور جانور میں تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور جہاں نہ کوئی آدمی ، آدمی ہوتا ہے اور نہ جانور جانور ـ

" میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ مورچے پر جا کر اپنی پوزیشن سنبھال لیتا تو شیبا میرے ساتھ ساتھ اس سرحد تک آتی جہاں تک آنے کی میں نے اس کو اجازت دے رکھی تھی ـــ اس کے بعد میں اُسے واپس چلے جانے کے لیے کہتا ـ سرگوشی کے انداز میں ـــ اس لیے کہ یہاں تیز سانس لینا بھی خطرے کا باعث ہوتا GO BACK SHEEBA ـ اور شیبا رجمنٹ سے جدا ہو جاتی اور ہمیں زمین کے سینے سے چمٹ کر رینگتا ہوا دیکھتی رہی ـ

یہاں سے وہ سرحد شروع ہو جاتی تھی جہاں سے ہمیں رینگ کر مورچے تک پہونچنا ہوتا تھا ـ نظروں سے اوجھل ہونے تک خود بھی زمین سے ہماری طرح ہی چمٹی ہوئی شیبا ہمیں دیکھتی رہتی ـ اور جب دوسری نصف شب کو میں کسی دوسرے کپتان کو چارج دے کر لوٹتا تو شیبا مجھے اس سرحد پر ملتی جہاں میں نے اس کو چھوڑا تھا ـ چوبیس گھنٹے بغیر کچھ کھائے پیئے شیبا میری منتظر رہتی ـ جب میں اس کے قریب پہنچتا تو وہ بے تحاشا دوڑتی ہوئی مجھ تک پہونچتی اور میرے قدموں میں لوٹنے لگتی ـ میرے بھاری بھرکم

لوٹ چاٹنے لگتی۔ اچھل اچھل کر اپنے اگلے پیر اور اپنا منھ میرے سینے پر مارتی، پھر میرے اطراف چکّر لگاتی اور یہ سب کچھ وہ اپنے حلق سے ذرا سی آواز نکالے بغیر کرگذرتی جیسے وہ اچھی طرح جانتی ہو کہ یہاں ہر آہٹ خطرے کا پیش خیمہ ہے۔ اس کو اپنے قدموں کی چاپ پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ اس محبت کے مظاہرے کے وقت لگتا وہ زمین پر نہیں چل رہی ہے بلکہ ہوا میں معلق میرا طواف کر رہی ہے۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ کیمپ پہنچتے۔ میری رجمنٹ پو پھٹنے سے پہلے واپس ہوتی تھی۔ اس لیے نصف شب کو مجھے تنہا واپس ہونا پڑا۔ خطرے کی سرحد سے نکلنے کے بعد میں تنہا نہ رہتا اور یہاں سے شیبا رفیق سفر ہو جاتی۔ کیمپ میں جب تک میں رہتا وہ میرے سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی۔ ادھر کچھ دنوں ایک گورا میجر اس پر بہت ملتفت تھا۔ مچھلی اور پنیر کے ٹن کے ٹن وہ شیبا کی طرف بڑھا دیتا۔ وہ ٹن چپکے سے اٹھا لاتی اور میس (MESS) میں مجھے تلاش کرتی ہوئی میرے پاس آکر اطمینان سے کھانے لگتی۔ یہ میجر وہی بلڈی باسٹرڈ ہے جو میرے پسٹل کا نشانہ بنتے بنتے رہ گیا۔"

اس کا خالی مگ میں نے بیئر سے بھر دیا تو مسعود نے مگ اٹھا کر اپنے دائیں گال سے لگا لیا پھر بائیں گال سے۔ پھر ہونٹوں سے لگا کر اس نے آدھا مگ خالی کر دیا۔

"تو ــــ گویا تم رقابت کے جذبے کا شکار ہو گئے تھے۔" میں نے لقمہ دیا۔

اس نے مگ میز پر رکھا نہیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ اپنی ہتھیلیوں کو ٹھنڈک پہنچاتا رہا۔ لمحہ بھر خاموش رہ کر میری مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیے بغیر کہنے لگا۔

"بالکل نہیں ۔۔۔ رقابت کا سوال ہی نہیں تھا۔ کوئی شیبا کا خیال رکھتا، اس سے اچھا سلوک کرتا تو مجھے سکون ہوتا ۔۔۔ لیکن اس بلڈی باسٹرڈ نے شیبا پر مظالم ڈھائے۔ ایسے مظالم جو ایک فوجی کے نہ صرف شایانِ شان نہیں ہوتے بلکہ اس کو نظروں سے گرا دیتے ہیں۔ ہم تو اپنے ہنستے دشمن سے بھی ایسا برتاؤ نہیں کر سکتے۔ یہ ملٹری ڈسپلن کے خلاف ہے۔ چہ جائے کہ اپنی محبوبہ سے ایسا برتاؤ کیا جائے جس نے اس بلڈی باسٹرڈ کے جنسی جذبے کی تسکین کی۔ اس کو تکلیف سہہ کر بھی سکون بخشا۔ تمھیں معلوم ہے؟ اُس نے ایک شب شیبا سے اپنا منھ کالا کیا۔

"رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے شیبا کے کراہنے کی آواز سنی۔ بستر سے کمبل جھٹک کر میں اٹھا اور آواز کی طرف لپکا۔ سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ میں بھول گیا تھا کہ مجھے دستانے اور لانگ کوٹ پہن لینا چاہیے تھا۔ میں بہت جلد اُس کیمپ کے پاس پہنچ گیا جس میں شیبا کراہ رہی تھی۔ سپاہی ڈھلتی ہوئی رات میں گہری نیند کا مزہ لوٹ رہے تھے۔ میں نے باسٹرڈ کے کیمپ کے داخلے پر پہنچ کر منٹ بھر کو توقف کیا۔ پھر کیمپ میں داخل ہو گیا۔ کیمپ کا اندرونی حصہ گڑھے میں جلتی ہوئی آگ کی وجہ سے بہت گرم تھا۔ باسٹرڈ شیبا کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔ شیبا کے اگلے اور پچھلے پیر بندھے ہوئے تھے اور اس حرامی پلّے نے اس کو اپنے ہاتھوں

میں اٹھا رکھا تھا۔ شیبا نے مجھے دیکھا نہیں۔ البتہ اس حرامی نے مجھے بڑی نخوت سے دیکھا اور بڑے ہی تحکمانہ لہجے میں کہا "BE OUT"

"میں نے اتنے زمانے سے خود بھی فوج میں مجرد زندگی گزاری تھی۔ مجھے اس کا تو علم تھا کہ بہت سے سپاہی تسکین کے لیے غیر فطری انداز اپنا لیتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک آدھ سپاہی جو کم عمر اور خوبرو ہوتا وہ بہت سوں کا منظور نظر ہوتا۔ وہ اس سے ملوث نہ بھی ہو پاتے تو اس کو چھیڑ کر اس کی گالیاں سن کر اس کی برہمی سہ کر ہی لطف اٹھا لیتے اور اس کے ساتھ کھانے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے لیے ایک دوسرے سے جھگڑ پڑتے ۔۔۔ وہ کسی پر مہربان ہو جاتا تو رقیبوں کا گروہ کا گروہ اس سے جلنے لگتا۔ خود میری رجمنٹ کے ایک نوعمر سپاہی کے تعلق سے مجھے اس قبیل کے کئی قضیے چکانے پڑتے۔ بات بالکل کھل کر تو میرے آگے نہیں آتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ کون معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔

"لیکن ٹھنڈ سے اس ٹھٹھری ہوئی رات میں کوئی برف کی باریک سی قاشیں میرے جلتے ہوئے دماغ پر اس طرح رکھ دے گا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے جب اس باسٹرڈ کے کیمپ میں اس کو اس عالم میں دیکھا تو غصہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا۔ ایک احساس شرم تھا۔ ایک ایسی ندامت تھی جس کی نہ میں کوئی توضیح کر سکتا ہوں نہ خود اپنے ان احساسات کی وجوہ جانتا ہوں۔ ندامت تو اس نطفۂ قنذیر کو ہونا چاہیئے تھی۔ شرم تو اس بلڈی باسٹرڈ کو آنی چاہیئے تھی۔

"میں سر جھکائے اپنے کیمپ میں لوٹ آیا اور رات کا باقی حصہ سو نہ سکا۔ صبح کیمپ سے باہر نکلا تو شیبا نے معمول کے مطابق نہایت ہی گرمجوشی سے میرا سواگت

کیا۔ وہ میرے پیروں پر لوٹنے لگی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار شیبا سے ایک عجیب قسم کی بیزارگی محسوس کی۔ نہ اس سے ٹھٹھول کیا، نہ کھیلا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شیبا سے اس قدر سرد مہری سے پیش آؤں۔ لیکن ایک خلیج سی اس کے اور میرے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ میری شیبا جو میری مونس تھی۔ میری غمخوار تھی کسی مرد کے اس جذبے کی تسکین کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ اور جب مجھے شیبا کے اس روپ کا احساس ہوا تو مجھے اس سے گھن آنے لگی۔

"کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ میری عدم توجہی پر بھی شیبا کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا — ادھر اس انگریز میجر کا شیبا پر التفات فزوں تر ہوتا گیا۔ مچھلی اور بینر کے ٹن وہ اس کی طرف بڑھاتا تو بھی شیبا اس کے قریب نہ جاتی۔ وہ خود قریب آنے کی کوشش کرتا تو شیبا غرّاتی اور بھاگ جاتی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا تو میرا جی چاہتا کہ اس بے شرم باسٹرڈ کا منہ نوچ دوں۔ پتہ نہیں اس کی غیرت کو کیا ہو گیا تھا کہ مجھ سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اُسے شرم نہیں آتی تھی۔ ادھر خود میرا یہ حال تھا کہ تنہائی میں بھی شیبا کو میں نے آغوش میں لینا چھوڑ دیا تھا۔ اس سے قرب کا احساس میرے ذہن میں ایک بالکل نیا تصور لے آتا تھا جو آج تک کبھی بھی مجھ میں اور شیبا میں وجہ رفاقت نہ ہو سکا تھا۔ اب یہی تصور شیبا سے میری بیزارگی کا باعث تھا۔

"کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شیبا میری اس بے اعتنائی کے احساس سے مجھ سے اور قریب ہونا چاہتی ہے۔ تاکہ میں اپنا یہ رویہ تبدیل کر دوں۔ چنانچہ

وہ اب کچھ زیادہ ہی میرے قریب رہنے لگی۔ ادھر ادھر باہر گھومنے پھرنے کے لیے بھی کم ہی جاتی۔ معمول سے زیادہ ہی میرے پیروں کو چاٹ کر میرے قدموں پر لوٹنے کی کوشش کرتی۔ پھر ترنگ میں آکر ہوا میں جست لگاتی اور ٹیڑھی ترچھی سامنے کھلے میدان میں سرپٹ بھاگتی اور پھر ایک دم رک کر اسی طرح میری طرف لوٹ آتی۔ میری دلداری کرنے کی شیبا کی اس ادا پر مجھے ترس آتا اور میں اس کی محبتوں کا جواب چاؤ اور لاڈ سے دینے کے لیے باولی ناخواستہ خود کو تیار کر بھی لیتا تو نہ اس کو اپنی آغوش میں لے کر بھینچتا نہ گود ہی میں اٹھاتا۔ بس ذرا سا اس کی پیٹھ سہلا کر اس کے سر پر اپنا ہاتھ پھیر کر اس کو تھپک کر جیسے روتے ہوئے کے آنسو پونچھ دیتا۔ ایسے میں بھی جب کہ میں شیبا سے کچھ دلار سے پیش آ رہا ہوتا اور اس بلڈی باسٹرڈ کی نظر ہم پر پڑ جاتی تو مجھے لگتا کہ اس کی بھوکی آنکھیں کسی اور ہی جذبے سے شیبا کے صحت مند جسم کو تک رہی ہیں۔ اس جسم کو جو بجلی کی سی تیزی سے میرا طواف کر رہا تھا مجھ پر نچھاور ہوا رہا ہوتا۔ اس وقت اس حرامی میجر کی زہریلی مسکراہٹ میرے تن بدن میں آگ سی لگا دینے کے لیے کافی ہوتی۔ وہ شیبا کو بہت پچکارتا۔ سمجھا منا کر قریب بلانے کی کوشش کرتا لیکن شیبا جیسے اس کے سائے سے بھی خوف کھاتی تھی۔

"اس واقعہ کے بعد میں نے مسلسل دیکھا تھا کہ شیبا، بلڈی باسٹرڈ کی پہنچ سے باہر تھی۔ وہ جو اس پر التفات کرتا۔ چاؤ اور پیار کا برتاؤ کرتا۔ میرے آگے سعادت مندی سے اپنی گردن جھکا دینے والی شیبا اس گورے میجر کے لیے

ایک ناقابلِ تسخیر شے بن گئی تھی۔

"میں جب مورچے پر ہوتا تو شیبا سرحد پر میری منتظر ہوتی۔ میں جب کیمپ میں ہوتا تو شیبا جیسے میرا سایہ بنی رہتی۔

"ایک روز میں اپنے کیمپ میں سو کر اٹھا تو دن ڈھل رہا تھا۔ آج خلافِ معمول اس وقت میری آنکھ کھل گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ پچھلی رات میرا جسم شدید بخار میں پھنکتا رہا تھا۔ آج بھی کچھ حرارت تھی اور طبیعت بڑی کسل مند تھی۔ اس کس مپرسی کے عالم میں صحت جواب دے دے تو آدمی کے احساسات بڑے لطیف اور نازک ہو جاتے ہیں لیکن اس نزاکتِ احساس کی عمر بڑی مختصر ہوتی ہے اور جب آدمی موت سے آنکھیں ملانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے سارے جذبے پہلے ہی مر چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندگی کی ساری توانائیوں سمیت اس موت پر فتح پانے کا درپے ہے جو ان جذبوں کے ساتھ زندگی کو بھی ہمیشہ کی نیند سلا دینا چاہتی ہے۔

"میں اپنے جذبات کے کفنائے جانے کی یہ داستان یہاں شروع نہیں کروں گا۔ تم انتظار کرو۔ فی الوقت تو بس اتنا سمجھ لو کہ اس شام بھی جب کہ میں سو کر اٹھا تھا تو میرے بوجھل پپوٹوں میں میرے ناتمام خوابوں کی کرچیں کھٹک رہی تھیں۔ ان ناتمام خوابوں کی کرچیں جو کبھی مکمل زندگی تھے۔ میرے احساسات پر کوئی پتھراؤ کر رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اس لذتِ سنگ کو چھپائے بیٹھا تھا جو میری بیوی اور بچی کی باتیں نے مجھے بخشی تھیں۔

"میں آنکھیں ملتا ہوا کیمپ سے باہر آیا تو خلاف توقع شیبا میرے سواگت کو نہیں آئی۔ میں نے سوچا کہیں گھوم پھر رہی ہوگی۔"

اس نے بیر کا مگ خالی کرنے سے پہلے دو چار چسکیاں لیں پھر کچھ اس طرح سے اپنے ہونٹ مگ کے کناروں سے لگائے۔ خیالوں ہی خیالوں میں کہیں دُور چلا گیا جیسے اس مگ میں بیر کی بجائے یادیں تیال ہو کر رہ گئی ہوں۔ اور جب تصوّرات کی اس دنیا سے وہ لوٹ آیا تو مگ خالی ہو چکا تھا۔

میں نے اس کا اور اپنا مگ بھر لیا۔

"آج غم اس طرح دل کا اساسہ بن گیا تھا کہ میں بھی خیالوں کی انجمن اسی سے سجا لینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ دو پیڑوں کا تو دل کی بے مایۂ ناز انجمن بھائیں بھائیں کرنے لگی اور پھر یہاں سناٹے بولنے لگیں گے۔ خوب روئیں تو بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے زندگی کی قیمت ہم نے ادا کر دی ہے، جیسے زندگی کا قرض ہم نے چکا دیا ہے۔ اور کوئی قرض اتر جائے، تو ذہن کتنا ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے کتنا مطمئن، اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے مقروض زندگی گزاری ہو۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں یہ قرض چکا دوں۔

"لیکن اس وقت کم سے کم شیبا ہی مجھ سے پیار کرے۔

"میں اس پیار کا طالب تھا۔

"یکایک مجھے خیال آیا شیبا کسی مصیبت میں گرفتار تو نہیں ہو گئی۔ اسی بلڈی باسٹرڈ کا اسی نقطۂ تفذ ر کے کرتوت تو نہیں کچھ؟

ایک ثانیہ میں یہ وہم یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ اور میں اس کے

کیمپ کی طرف چل پڑا۔

کیپٹن ڈاکٹر گرمیت سنگھ جس کا میں نے پہلے بھی نام لیا ہے میس (ESS ۸۸) سے واپس لوٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے باسٹرڈ کے متعلق دریافت کیا تو گرمیت نے بتایا کہ وہ وہاں نہیں آیا۔

"میں اس کے کیمپ کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا تو گرمیت کچھ تاڑ گیا۔ اس کو میری اور باسٹرڈ کی وجہ مخاصمت معلوم تھی۔

"اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں نے اس کو صرف اتنا بتایا کہ شیبا غائب ہے۔ میرے تیور بدلے ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے گرمیت بھی میرے ساتھ ہو گیا۔ اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے اخلاقیات کو بالائے طاق رکھا اور دندناتا ہوا باسٹرڈ کے کیمپ میں گھس گیا۔ گرمیت باہر ہی ٹھہر گیا۔

"میں نے کیمپ میں پہنچ کر دیکھا کہ باسٹرڈ یونیفارم پہن رہا ہے اور قمیص کے بٹن اس نے ابھی نہیں لگائے ہیں۔ شیبا ایک گوشے میں پڑی ہے۔ اس کو ہیلمٹ سے کس دیا گیا تھا اور اس کے پچھلے دائیں پاؤں سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

"میں بغیر کچھ کہے شیبا کی طرف لپکا۔ باسٹرڈ نے میرے انداز نظر ہی سے بھانپ لیا تھا کہ میں بہت برہم ہوں۔ اس نے مجھے بلا اجازت اس کے کیمپ میں داخل ہونے پر ٹوکا۔ میں نے پروا نہ کی اور شیبا پر جھک گیا۔ اس کا تازہ زخم رس رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پسٹل کی گولی سے شیبا کو زخمی کیا گیا ہے۔ میں نے چمڑے کا تسمہ کھول کر اس کو آزاد کر دیا تو باسٹرڈ نے مجھے ہندوستانی غلام

کہہ کر مخاطب کیا۔

"شیبا میرے قدموں میں لوٹ رہی تھی، وہ درد کی شدت سے کراہ رہی تھی اور چلنے کے قابل نہ تھی ـــــــــ میں نے بھی اس کو گالی دی۔ بلڈی باسٹرڈ ـــ اور لپک کر اس کے مقابل ہو گیا۔ میری بلند آواز سن کر گرمیت کیمپ میں داخل ہو چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ قریب آ کر وہ بیچ بچاؤ کرتا میں نے باسٹرڈ کے ایک مکّہ جڑ دیا تھا۔ اس نے بھی ایک لات لگائی اور میں نے پلک جھپکتے پسٹل نکال کر اس پر فائر کر دیا۔ گرمیت میرے ہاتھ کو اپنی مضبوط گرفت سے جھٹکا نہ دیتا تو شاید باسٹرڈ وہیں ڈھیر ہو گیا ہوتا۔"

"گرمیت نے ہم دونوں کو جدا کیا باسٹرڈ غصہ سے کانپ رہا تھا۔ وہ اس حادثہ کے لیے ذہنی طور پر قطعی تیار نہ تھا۔ برخلاف اس کے میں ہر بات کے لیے تیار ہو کر اس کے کیمپ میں گھس آیا تھا۔ اس نے خاموش رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی لیکن دکھاوے کے لیے گالیاں بکتا رہا۔ اس اطمینان میں کہ گرمیت اب مجھے اس کے قریب آنے نہ دے گا۔

"گرمیت مجھے گھسیٹ کر باہر لے جانے لگا تو میں نے شیبا کو گود میں اٹھا لیا اور ایک بار پھر خشونت بھری نگاہوں سے پلٹ کر باسٹرڈ کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی غراتے ہوئے کہا کہ وہ مجھے مزہ چکھائے گا۔

"ڈاکٹر گرمیت نے کیمپ ہاسپٹل میں شیبا کی مرہم پٹی کی۔
ہمیں یقین تھا کہ میرے خلاف "تادیبی کارروائی" کی جائے گی۔ محاذ

پر زندگی کی یکسانیت سے ویسے بھی میں اکتا چکا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ کیا جانے والا تھا اس کے لیے میں تیار تھا۔ زندگی میں کون سی خوبصورتی رہ گئی تھی، جس کے چھن جانے کا غم ہوتا۔ یہی نا کہ لے دے کر ایک شیبا تھی سو اس کا بھی یہ حشر ہو گیا تھا۔

" لیکن اسی رات جاپانیوں نے ہم پر زبردست حملہ کیا۔ ہمارے بہت سے ساتھی کام آئے اور جب ہم نے ہتھیار ڈال دیے تو ہمیں قید کر لیا گیا۔ کیپٹن ڈاکٹر گرمیت سنگھ نے باسٹرڈ کی جان بچائی جب وہ ایک کھائی میں زخمی ہو کر اوندھا پڑا سسک رہا تھا۔

" شروع شروع میں تو ہم سے ایسا سلوک کیا گیا جو جانوروں سے بھی نہیں کیا جاتا۔ میں نے شیبا کو آخری بار اس وقت دیکھا جب کہ مجھے نہتا کر کے قیدیوں کے غول میں لے جایا جا رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر زخم تھے۔ اس کی پچھلی ٹانگ پر باندھی ہوئی پٹی کھل گئی تھی اور اس کے زخم سے مٹی ہوئی زمین پر اس کے ساتھ رینگ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میں ٹھہر گیا تو وہ گھسٹتی ہوئی مجھ تک پہنچی۔ میرے زخمی پیر چاٹے لیکن ایک جاپانی فوجی نے مجھے پیچھے سے دھکا دے کر آگے بڑھا دیا اور شیبا کے ٹھوکر لگا دی تو وہ کراہ کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنے جسم کا پچھلا حصہ زمین پر ٹکائے اگلے دونوں پاؤں کے سہارے گھسٹتی ہوئی پھر اس سمت بڑھ رہی تھی جس سمت ہم قیدیوں کو لے جایا جا رہا تھا۔

"میں نے دیکھا باسٹرڈ کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی زخم

کا نمبر تھا لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ شیبا کے برابر سے گزرنے لگا تو اس نے جھک کر بڑے چاؤ سے شیبا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ شیبا نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی لیکن کسی جاپانی فوجی نے بندوق کے کندے سے شیبا کے سر پر چوٹ لگائی تو وہ تڑپ اٹھی۔ زخمی باسٹرڈ نے اسی لمحے جاپانی فوجی کی ناک پر پوری قوت سے مکہ جڑ دیا اور وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ ایک شور مچا ـــ جاپانی فاتح فوجیوں نے اس اہانت کے جواب میں باسٹرڈ کو زدو کوب کیا، اور ہم قیدیوں کے اطراف بندوقیں تان لی گئیں۔ اور ہم سر جھکا کر آگے بڑھنے لگے۔

"دوسرے دن جب ہمیں راشن کی تقسیم کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو باسٹرڈ مجھ سے ملا۔ وہ میرے قریب آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"تمھاری گولی کاش میرے سینے کے پار ہو جاتی۔ میں غلامی کے یہ دن دیکھنے کے لیے تو زندہ نہ رہتا۔ اس نے اپنے زخمی ہاتھوں سے میرے ہاتھ تھام لیے اور مجھ سے آبدیدہ ہو کر معافی مانگی۔ میں نے تمھیں غلام ہندوستانی کہا تھا۔ اس کا آنسو میرے ہاتھ کی پشت پر گرا اور اس زخم کو بھگو دیا جو اس سے ہاتھا پائی کے وقت مجھے لگا تھا۔"

"بائیلڈ ایک میں کا ٹنا چبھو کر اس نے انڈے کو کالی مرچ اور نمک سے چھوایا اور مجھ سے لینے کے لیے اصرار کیا۔

میں اس داستان پارینہ میں اتنا کھو گیا ہوں کہ مجھے یہ بھی نہیں یاد رہا کہ تم میرے گھر میں میری ہی مدارات کر رہے ہو۔"

اُس نے مجھے اشارہ کیا اور مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا دیا۔ جب ہم نے بئیر ختم کر لی تو اٹھ کر فرج سے ایک اور باٹل نکال لایا۔
میں نے دیکھا میری مسز اکیلی بیٹھی اپنے نومولود کو دودھ پلا رہی تھی۔
کیپٹن مسعود الزماں زیدی بھی میری بیوی کو تنہا دیکھ کر بڑا غیر مطمئن سا تھا اس نے اپنی بیوی کو پکارا۔ میکی، میکی ـــــ لیکن اس پیار بھری آواز کا کوئی جواب کہیں سے نہیں آیا تو وہ خاموش ہو رہا۔
میں نے دیکھا اپنے چہرے پر مسکراہٹ کی چاندنی چھکا لینے کی اس نے اس طرح کوشش کی جیسے پَو پھٹے تازہ قبر کو سورج کی کومل کرنیں قبرستان بھر میں نمایاں کر دیتی ہیں۔
مجھے چہرے کی اس چاندنی میں دور دور تک تاریکیاں نظر آئیں۔
ایسی تاریکیاں جس میں سب کچھ کھو چکا ہو۔
قبر کی تاریکیاں جو ڈھانکی جا رہی ہوں۔
قبر کی تاریکیاں جو ڈھانک دی گئی ہوں۔
اور کیپٹن مسعود الزماں زیدی نے بئیر کا بھرا ہوا مگ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔
وہ آدھا مگ چڑھا گیا تو مجھ سے کہنے لگا کہ میں جلدی سے پی جاؤں تاکہ ہم مل جل کر کھانا کھا سکیں اور میری بیوی کی تنہائی ختم ہو۔
مجھے اب سمجھ میں آیا کہ مسعود الزماں زیدی کی چہیتی میکی میری بیوی کو تنہا چھوڑ کر کہیں جا چکی ہے جب کہ ہم سب اس کے مہمان ہیں۔

"بھابی کہاں گئیں ۔۔؟" میں نے پوچھا۔
میری بیوی کو تنہا دیکھ کر ہی کیپٹن زیدی کے سینے میں گولی لگ چکی تھی۔
میرے اس سوال نے جیسے اس گولی کو کھینچ کر باہر نکال لیا اور کیپٹن زیدی
تڑپ کر رہ گیا۔
میں نے بھی بات نہیں بڑھائی ۔۔۔ اپنی بیوی کو آواز دے کر اسی ٹیبل
پر بلا لیا ۔۔۔ میں نے مختصراً اس کو بتایا کہ زیدی اپنی محاذ کی زندگی کے بڑے
دلچسپ واقعات سُنا رہے ہیں۔
"کھانا یہیں منگوا لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا"
اور زیدی نے ملازم کو آواز دی۔ پھر حکم دیا۔
میرے ذہن میں اب دور دور تک شیبا کے لیے کہیں جگہ نہیں تھی۔
اب تو زیدی کی جھینپی ہنسی میرے ذہن پر ہتھوڑے لگا رہی تھی لیکن
زیدی کو اس درد و کرب سے نکال لینے کے لیے میں اس کو اس کے گھر سے پھر محاذ
تک لے چلا۔
"ہاں تو پھر کیا ہوا؟"
"کیا کہہ رہا تھا میں ؟"
"یہی کہ گورے ملٹری باسٹرڈ نے اپنے زخمی ہاتھوں سے تمھارے ہاتھ
تھام لیے اور آبدیدہ ہو کر معافی مانگی۔
"دوسرے دن ہم قیدیوں کو ہماری بٹالین کے مطابق مختلف کیمپس
میں منتشر کر دیا گیا اور سختی سے پابند کر دیا گیا کہ ہم اپنے دوسرے ساتھیوں

سے نہ ملیں۔

"ہم دل کھول کر نہ کسی سے کچھ پوچھ سکتے تھے نہ آپس ہی میں بات کر سکتے تھے۔ سب میں رہ کر بھی ہم تنہا تنہا تھے۔ اس بے دلی کو دور کرنے کے لیے سگریٹ ہی ایک ساتھی ہو سکتا تھا۔ سو وہ بھی میسر نہ تھا۔ کوئی جاپانی سپاہی رحم کھا کر ایک آدھ سگریٹ پھینک دیتا تو کئی سپاہی ایک ایک کش لگا لیتے اور یہی ایک جلتا ہوا سگریٹ کتنوں ہی کی دلجوئی کا باعث ہوتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میری حمیت یہ گوارا نہ کرتی۔

"مختلف افواہیں ہم سنتے رہتے، ہمیں ٹوکیو لے جایا جائے گا، ہمیں شوٹ کر دیا جائے گا، یہ بتانے کے لیے کہ ہم زندہ سلامت ہیں ہم سب قیدیوں کو ریڈیو سے ایک ایک نشریہ کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔ یہ اپنی سلامتی کا پیام ہوگا۔ جو ہم اپنی بیوی بچوں کو اپنے عزیز و اقارب کو دے سکیں گے۔

"جب ہم نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے اور محاذ پر مصروف [illegible] تھے تو ہمیں اپنے بچے کچھ اس طرح یاد آتے تھے جیسے کوئی آہستہ سے دل سے ہو کر گزر جاتا ہے لیکن جب سے ہم قید ہو گئے تھے کچھ ایسا عالم تھا جیسے دل ایک ویرانہ ہے جہاں خانہ بدوش یادوں کا ایک قافلہ ٹھہرا ہے۔ آگ جلتی ہے۔ آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور یہ قافلہ روانہ ہو جاتا ہے۔ اور ہم ٹھنڈی راکھ کو دل کے ویرانے میں ادھر ادھر اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

"یادوں کی اس اڑتی ہوئی راکھ میں مجھے شیبا بھی نظر آئی۔

"اپنا پچھلا دھڑ زمین پر ٹکائے اگلے پیروں کے سہارے رینگتی ہوئی شیبا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آج بھی اپنی زندگی کو میں اسی طرح گھسیٹ رہا ہوں، جیسے شیبا ان دونوں کو گھسیٹ رہی تھی۔

"میرا ذہن پھر میگی کی طرف منتقل ہوا لیکن میں نے اپنے ذہن سے اس کو اس طرح نکال دیا جیسے ابھی ابھی وہ خود ہمیں اپنے ہی گھر میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

قید ہوئے ہمیں تیسرا دن تھا،" وہ کہنے لگا " سارے قیدیوں کو کھلے میدان میں دھوپ کھلانے کے لیے لایا جا رہا تھا۔ پھر ہمارا طبی معائنہ ہونے والا تھا۔ یکایک میری نظر گورے میجر پہ پڑی وہ اکڑ ا ہوا بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے شیبا پڑی تھی۔ خوشی مجھے اس طرح مل گئی جیسے کسی بھوکے فقیر کو راستے میں پڑا ہوا روپیہ مل جاتا ہے۔

"شیبا زندہ ہے لیکن گورا میجر اس کے زخم سے کیڑے چن چن کر نکال رہا تھا اور وہ اس کے زخمی پیروں کو چاٹ رہی تھی۔

"شی — با —" میں نے اس کو پکارا۔

"وہ اس طرح اٹھی جیسے دنیا بھر کی طاقتیں اس نے سمیٹ لی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں کسی کھوئی ہوئی چیز کے پا جانے کی مسرت بخش چمک تھی۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بے چینی سے میری متلاشی تھیں۔

"شیبا — شی — با"

میں نے پھر پکارا۔

"اس نے تڑپ کر مجھے دیکھا اور شاید یہ بھول گئی کہ اس کا نچلا حصہ بیکار ہے

چکا ہے۔ اضطراری کیفیت میں اس نے جست لگائی اور وہیں گر پڑی۔ پھر اٹھی اور پوری قوت سے اپنا جسم گھسیٹتی ہوئی میری طرف بڑھی۔

"کل سارے قیدی سائیگان لے جائے جائیں گے۔ وہ لوگ جو ریڈیو پر اپنے بیوی بچوں کو کچھ پیام دینا چاہیں وہ اپنے نام نوٹ کرا دیں۔"

لاؤڈ اسپیکر پر جاپانی میں بولتی ہوئی ایک آواز کا ترجمہ کبھی ہمیں فوری بعد سنایا جا رہا تھا۔ سب کے سب اس آواز کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میری آنکھیں شیبا کو تک رہی تھیں۔ میرے کان آواز کو سن رہے تھے۔ شیبا میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کا ادھ مرا جسم زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ وہ کراہ کر دم بھر کے لیے رکتی پھر پوری قوت سے میری طرف بڑھتی۔ میں خاردار لوہے کے تار کے احاطے میں کھڑا شیبا کو اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھتا رہا۔ کیمپ لے پر گونجتی ہوئی آواز کو سنتا رہا۔ کل مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔ شیبا کو اسی حالت میں چھوڑ کر۔ شیبا کو جو ادھ مرے جسم کے ساتھ میری تلاش میں یہاں تک چلی آئی ہے۔ شیبا کو جو میری آواز سن کر اپنے مرتے ہوئے جسم کی ساری تکلیفیں بھول چکی ہے۔ شیبا تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔ اس کے جسم سے کیڑے چننے والا گورا میجر بھی کل یہاں نہیں رہے گا۔ میں نے بے طرح پھرتی سے کام لیا۔ جاپانی سپاہی کی کمر سے بندھا ہوا پسٹل میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے کیا کہ وہ مزاحمت بھی نہ کر سکا اور میں نے پسٹل کی ساری گولیاں شیبا کے سینے میں داغ دیں ــــ اور گولیوں کے بعد بھی پسٹل خالی ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا مجھے کوئی احساس نہ تھا اور میں خالی پسٹل کی لبلبی دبائے جا رہا تھا۔ یہاں تک

کر دوسرے سپاہی جمع ہو گئے اور انھوں نے پسٹل مجھ سے چھین لیا۔

" گورا میجر پتہ نہیں کب دوڑ کے میرے پاس آ گیا تھا۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے جھنجھوڑ رہا ہے۔

" میں نے نڈھال ہو کر اس کے سینہ پر اپنا سر رکھ دیا اور اس سے پہلے کہ میں رو پڑوں — گورا میجر رو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم اگر یہ سب کچھ نہ کرتے تو میں یہی کر گزرتا۔ ہم اپنے کسی چہیتے کی زندگی کو اس طرح تو نہیں چھوڑ سکتے کہ موت اس کا تمسخر اڑائے۔

" لیکن مجھے گورے میجر پر اس کے آنسوؤں کے باوجود رحم نہیں آیا — میں نے اس سے کہا تم چلے جاؤ۔ خدا کے لیے تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ — اور وہ آنسو پونچھتا ہوا کہیں کھسک گیا۔ اس کے بعد میں نے اس کو پھر نہیں دیکھا۔ لیکن وہ مجھے یاد آتا ہے۔

" سیام پر بھی جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس لیے ہم کو SAIGON لے جایا گیا۔ جہاں سے میں نے ریڈیو پر مائیک کے سامنے صرف اتنا کہا کہ "میکی میں جب لوٹ آؤں گا تو تمھیں شیبا پکاروں گا"

پتہ نہیں میکی نے میری یہ آواز سنی یا نہیں — لیکن جب میں لوٹ آیا تو میں میکی کو آج تک شیبا نہیں پکار سکا ہوں۔ آج تک نہیں — میں اس کو کس طرح شیبا کے نام سے پکار سکتا ہوں ؟"

اس کے بعد مسعود الزماں زیدی بالکل خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر دھواں سا چھا گیا تھا۔ وہ شگفتہ چہرہ جس سے میں ابھی کچھ دیر پہلے اس کے اسی گھر میں

ملا تھا وہ میرے سامنے نہیں تھا۔

میں نے اس سے گھر جانے کی اجازت چاہی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو میں نے مصافحہ کیا ۔۔۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے۔

اس نے بہت جھک کر میری بیوی کو الوداع کہا لیکن اس سے نظریں چار نہیں کیں۔ ہم سیڑھیاں اتر کر پورٹیکو تک پہنچے تو ایک موٹر آ کر رکا میکی بڑے چاؤ سے کسی نوجوان کو الوداع کرتی ہوئی اتری۔

موٹر کی ہیڈ لائٹس آف ہوئیں تو میں نے دیکھا۔ یہ جوان مسعود الزماں کا کوئی دوست تھا جس سے میں کیپٹن مسعود کے گھر میں ہی متعارف ہو چکا تھا۔

میں نے مسعود کو خدا حافظ کہا اور اپنی کار اسٹارٹ کرنے ہی کو تھا کہ گھر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔

کیپٹن مسعود الزماں زیدی بے قرار ہو اٹھا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

"شیبا آ رہا ہوں ۔ شیبا ڈارلنگ" اور مزید انتظار کیے بغیر وہ لپک کر اپنے گھر میں جا گھسا۔

میکی نے ہاتھ ہلا کر ہم کو الوداع کرتے ہوئے کہا" شیبا ہماری بچی ہے، مسعود اس کے دیوانے ہیں وہ خود بھی ایک لمحہ انھیں نہیں چھوڑتی ۔۔۔ وہ سو رہی تھی، جاگ گئی ہے شاید"

میں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے کی لائٹ جلائی تو پورٹیکو منور ہو گیا۔ کاش میں کیپٹن مسعود الزماں زیدی کی تاریک زندگی میں روشنی کی کوئی کرن پھینک سکتا۔

کاش میں دنیا بھر کی محبتیں بٹور کر ایک لمحے کے لیے اس کے خالی
جھولی بھر سکتا۔
صرف ایک لمحے کے لیے۔
نیلکی کاش تم شیبا ہو سکتیں۔
اور میں نے کار بڑھادی۔

— —

رات کے راہی

کھٹ، کھٹ، کھٹ
بالکنی سے گزر کر وہ اس طرح سیڑھیوں کی جانب بڑھتی جیسے اپنے ہی سائے سے بچ رہی ہو ـــــ اور سیڑھیوں تک پہونچتے پہونچتے اس کا سایہ بھی چپکے سے اس کو چھوڑ کر دیوار کی اوٹ میں اس طرح جا چھپتا جیسے اس کی واپسی پر اس کی ساری ڈھکی چھپی تمناؤں، دبے دبے جذبوں، سہمی سہمی خوشیوں سمیت اس کو دبوچ لے گا۔

وہ چوروں کی طرح چپکے سے بالکنی سے گزر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھتی تو اس کا سایہ اس کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ آتا کیونکہ سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے اندھیرے کچھ اور بڑھ جاتے اور سایہ صرف اجالے کا ساتھی ہے۔

وہ دروازہ کھولتی اور لمحے بھر کے لیے سڑک کی آوارہ روشنی کرن کرن بن کر اس طرح اس کے دروازے میں در آتی جیسے سینے میں رازہائے سربستہ۔
اور پھر وہ مضبوط باہیں اس کے سارے وجود کو جکڑ لیتیں ـــــ پھر اس کا جسم اپنی ساری حرارتیں، اپنے سارے احساسات، اپنی ساری گھمبیرتا کو ایک ہی مرکز پر سمیٹ کر اپنا سب کچھ ان دونوں کھلے ہوئے ہونٹوں کو بخش دیتا جو تیزی سے اس کے اپنے پیاسے ہونٹوں کی طرف بڑھتے۔
وہ تڑپ کر اس کی باہوں سے لمحے بھر کے لیے نکلتی۔ دروازہ بند کر دیتی اور دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیئے سیڑھیوں پر چڑھ کر بالکنی میں داخل ہو جاتے۔ آہستہ آہستہ پیر دبا کر اس محتاط خرامی کے باوصف جاوید لڑکھڑاتا تو ذکیہ اسے سنبھال لیتی۔
لیکن ذکیہ کا سایہ اب ایک اور مضبوط و توانا سائے کے ہاتھوں مجبور محض بنا رہتا۔
کھٹ، کھٹ، کھٹ۔
بالکنی سے گزر کر وہ اس طرح سیڑھیوں کی جانب بڑھتی جیسے اپنے ہی سائے سے بچ رہی ہو۔
کھٹ، کھٹ، کھٹ۔
بالکنی سے گزر کر ـــــ
اور یہ اس کا روز ہی کا معمول تھا۔
بالکنی سے لگا ہوا جاوید کے والد کا کمرہ تھا۔ جاوید کا والد شدید

ذیابیطیس کا شکار تھا۔ بیٹھا بیٹھا چکرا جاتا۔ بعض وقت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اجالے میں اس طرح گھورتا جیسے اندھیرے میں سجھائی نہیں دے رہا ہو ـــــ بعض وقت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اجالے میں اس طرح گھورتا جیسے اندھیرے میں سجھائی نہیں دے رہا ہو ـــــ بعض وقت پڑا پڑا اونگھتا رہتا۔ اس کی ساری قوتیں بس سمٹ سمٹا کر اس کی زبان میں جمع ہو گئی تھیں ایک پل بھی ضائع نہ کرتا اور فوراً باتیں شروع کر دیتا۔ کوئی ضروری نہیں کہ جس سے باتیں کر رہا ہو وہ چار پانچ برس کا بچہ یا بچی نہ ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس آدمی سے باتیں ہو رہی ہوں اس کی اپنی بیوی پاس ہی کہیں دردِ زہ سے چلا نہیں رہی ہو ـــــ نہ عمر کی قید، نہ موقع محل کی تخصیص۔ جو ملے، جہاں ملے، جس عالم میں ملے۔ جاوید کے والد اپنی زبان قینچی کی طرح چلانے لگتے۔ اور کتنے ہی نازک لمحوں پر یہ زبان اپنا عمل جراحی کر دیتی اور وقت زخمی پرندے کی طرح اس کے آگے پھڑپھڑاتا۔

یہی وجہ تھی کہ ذکیہ اپنے چاہنے والے شوہر کے انتظار میں جب بے کل ہو جاتی تو اس طرح سانس روکے پڑی رہتی جیسے جاوید کا باپ اس کی تیز تیز سانسوں سے یہ اندازہ لگا لے گا کہ ذکیہ جاگ رہی ہے۔ پھر وہ اس کو پکارے گا۔

ذکیہ ـــ ذکی بیٹی ـــ دو گھونٹ پانی۔

اور جب ذکیہ پانی پلانے کے جرم میں پکڑی جائے گی تو یہی پانی اس کے دل و دماغ میں زہر بن کر اترنے لگے گا۔ یہاں تک کہ وہ پاگل ہو کر چیخ پڑے گی۔ "ابا تم بہت جی چکے ہو ـــ اب مر بھی جاؤ۔

"ابا، میں اپنے جاوید کا انتظار کر رہی ہوں۔ تمہارے بیٹے کا۔ میرے اپنے شوہر کا اور تم مجھے اس انتظار کی لذت سے چمٹے رہنے دو۔
"ابا، اب وہ آئے گا اور اس کی باہیں، اس کے.....
"اُف ابا، تم اپنی موت کے تعلق سے کتنے غیر سنجیدہ ہو۔
"تم تو اس طرح جی رہے ہو جیسے کوئی پوپلا گنا کھاتا یا گنجا چٹیل میدان میں اپنی چندیا کوا ولوں سے بچاتا ہو۔"
کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

وہ بے تحاشہ جاوید کے لیے بھاگتی لیکن بالکنی تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنے ہی سائے سے خوف کھانے لگتی۔ اس لیے کہ وہ بچ بچ کر سیڑھیوں تک پہنچنا چاہتی تو اس کا سایہ ابا کے کھلے ہوئے دروازے کی چوکھٹ کو بوسہ دیتا ہوا گزرتا اور اگر ابا جاگتا رہتا تو اس سائے ہی کی سازش ذکیہ کی گرفتاری کا باعث بنتی۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا تو بڈھا اپنی بہو اور بیٹے کو اس وقت تک دق کرتا جب تک کہ وہ سرکشی پر نہ اُتر آتے۔ اس وقت ان کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ان کی اپنی خلوت ہوتی۔

خلوت جو دو جسموں اور روحوں کا اتصال بن دونوں کے نس نس میں سما جاتی۔

اور اس وقت ابا اپنے بے مصرف وجود کا بوجھ اٹھائے ان کی پھولوں بھری رنگین خلوت میں بوریت کے کانٹے پھینکنے کے لیے کبھی کبھی جاگ جاتا۔
اسی لیے ذکیہ بالکنی سے گزر کر اس طرح سیڑھیوں کی جانب بڑھتی جیسے

اپنے ہی سائے سے بچ رہی ہو۔

لیکن ایک زخم تھا جو اتنی ساری محبتوں کے باوجود۔ اس بے پناہ سپردگی کے باوجود ذکیہ کے سینے میں کہیں رِس رہا تھا۔

ایک ایسا زخم جو محبتوں کی حفاظت کے لیے اپنی نرم نرم خلش کے ساتھ دل کے قریب ہی کہیں چپکے سے نمودار ہو جاتا ہے۔

جیسے کوئی پھولوں کو مَسل رہا ہو۔

جیسے کوئی گھنے سایوں کی ٹھنڈی فضا میں انگارے پھینک رہا ہو۔

جیسے کوئی اپنے بیٹے کی قبر پر سر جھکائے بیٹھا دور سے آتی ہوئی فاتحہ کی آواز سن رہا ہو۔

حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہوتا لیکن احساسات کچھ نہ ہونے کو بھی تو محسوس کرتے ہیں۔

اور اپنی زندگی سے مطمئن ہونے کے باوجود ذکیہ کسی ایسی ہی خلش سے دوچار ہو گئی تھی۔

"ذکیہ کا جاوید تو بڑا شرابی ہے"

"جاوید بڑا ذہین اور اچھا دوست ہے جو شراب کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔"

"اس کے لیے دنیا بھر میں سب سے زیادہ پیاری شے شراب ہو"

"اس کے بعد ذکیہ!؟"

"نہیں"

"ذکیہ کے بعد شراب کہو۔"

"بکواس ہے۔"

"پہلے شراب۔"

"نہیں جی، پہلے ذکیہ۔"

تم ہی بتا دو کہ ذکیہ۔ جاوید کے دوست ذکیہ ہی سے پوچھ بیٹھتے۔ وہ مسکرا مسکرا کر جاوید کو دیکھتی اور جاوید جام ہی لے کر کھڑا ہو جاتا۔

جیسے سب کے سب بکواس کر رہے ہوں لیکن پھر بھی وہ ذکیہ کا ہاتھ دبا کر آہستہ سے اس سے کہتا۔

تم مجھے شراب سے زیادہ عزیز ہو۔ اس لیے کہ تم خود شراب ہو۔"

اور وہ مسکرا کر جاوید کو دیکھتی رہ جاتی۔

لیکن ایک زخم تھا جو اس کے سینے میں کہیں رس رہا تھا۔

"جاوید شرابی ہے" "جاوید شرابی ہے۔"

"جو زندگی کا سارا حسن شراب کے لیے ٹھکرا سکتا ہے۔"

"جو ذکیہ کو

— اور ذکیہ نے ایک رات جاوید کے پاؤں آنسوؤں سے دھو دیے۔

"شراب چھوڑ دو جاوید۔ شراب میری خاطر چھوڑ دو جاوید۔ میرے لیے چھوڑ دو۔"

لیکن آدمی کبھی کبھی وقت کے ہاتھوں سے کیا کچھ نہ چھین کر قسمت کی جھولی میں پھینک دیتا ہے۔ صرف اس تصوّر میں کہ وہ نیکی کی طرف جا رہا ہو۔

حالانکہ ایک وقت کی کھلے دل کی مسکراہٹ سب سے بڑی نیکی ہے۔
جاوید نے ذکیہ کو اپنے قدموں سے بڑے چاؤ سے اٹھایا اور جب اس کے ہونٹ اس کی آنکھوں سے جدا ہوئے تو زبان پر شراب کی تلخی کے ساتھ آنسوؤں کا نمک بھی تھا۔
اور پھر ذکیہ کے جسم کے روئیں روئیں سے پھوٹتے ہوئے مسرت کے شرارے آہستہ آہستہ پھول بن کر کھلنے لگے۔
اور ذکیہ کو جاوید کے اس وجود کے سوا کچھ بھی یاد نہ رہا جو پیاسی کھیتی پر متوالے بادل کی طرح جھوم جھوم کر چھا رہا تھا۔
اور جاوید نے شراب نہیں چھوڑی۔
گھٹ، گھٹ، گھٹ۔

اور یہ اس کا روزہی کا معمول تھا۔
جاوید ایک پرائیوٹ فرم میں اسسٹنٹ منیجر تھا۔ دن بھر بڑی محنت اور لگن سے کام کرتا اس کی زندگی ایک بندھا ٹکا پروگرام تھی جس میں ایسی یکسانیت آگئی تھی جو بجائے خود زندگی کا ایک حسن بن کر رہ گئی تھی۔
رات کا متوالا جاوید صبح پو پھٹتے وقت بیدار ہوتا۔ آنکھوں میں سرخ ڈوروں کے سوا کوئی اور علامت نہ ہوتی جو رات کا راز کھلائی جا سکے۔ ذکیہ ابھی تک سوئی رہتی ــــ جاوید شیو کرتا اور غسل خانے میں گھس جاتا۔ اور جب وہ نہا دھو کر دھان پان سا سیٹی بجاتا ہوا غسل خانے سے نکلتا تو ذکیہ جماہیاں لیتی ہوئی، انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی اور اپنے کپڑوں

کو درست کرتی ہوئی بستر سے چھلانگ لگا کر اس چھپاکے سے غسل خانے میں گھس جاتی جیسے اپنے بدن کی رعنائی جاوید کی تیز تیز نگاہوں سے بچا رہی ہو۔ وہ دیر تک نہاتی رہتی ــــ اپنے جسم کو پانی کے چھپاکوں سے کچھ اس طرح تھم تھم کر ٹھنڈک پہنچاتی جیسے کوئی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں پر چھینٹے دے رہا ہو۔ وہ دھیمے سُروں میں جوانی اور بہاروں کے گیت گاتی۔ ایسے گیت جو ہمارے شاعروں نے ابھی نہیں لکھے ہیں ــــ ترنگ میں ہونے سے اس کی آواز کبھی تیز ہو جاتی تو جاوید سن سن کر آپ ہی آپ خوش ہوتا ــــ کبھی ان آوازوں سے وہ خود اتنا ترنگ میں آجاتا کہ اٹھ کر غسل خانے کے دروازے کو کھٹکھٹانے لگتا۔

"جانِ من جلدی کرو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

ذکیہ اس کی آواز سن کر کھنکتی اور اونچے سروں میں گانے لگتی۔

کبھی جھٹ سے دروازہ کھول کر سامنے آجاتی تو جاوید اس کے نکھرے ہوئے حسن کو دیکھ کر بھونچکا رہ جاتا۔

کبھی وہ "ناک" کرتا ــــ اور ذکیہ انداز سے پکارتی۔

"تم نے اخبار اتنا جلد پڑھ لیا؟"

"ہاں جان ایک ایک لفظ پڑھ لیا ہے۔"

"آ رہی ہوں۔"

"ابھی آجاؤ ذکی۔ بہت بھوک لگی ہے۔"

پھر دونوں مل کر میز پر دنیا بھر کی باتیں کرتے رہتے۔ بڈھا اپنے کمرے میں کبھی کبھی سانس لے کر اپنے زندہ وجود کا احساس انھیں دلا دیتا۔ کبھی کبھی

دس کی آواز ذکیہ اور جاوید کے کانوں سے اس طرح ٹکراتی جیسے کوئی آہستہ خرام موج ساحل کو ہلکے ہلکے چھو رہی ہو۔ وہ ناشتہ کرنے کے دوران میں کبھی باورچی سے کبھی جھاڑو لگانے والے لونڈے سے باتیں کیے جاتا۔ ذکیہ اور جاوید کو اس بات کا احساس ستاتا کہ باورچی یہاں رہتا تو پانی کے لیے یا شکر یا دودھ کے لیے انھیں اپنی جگہ سے اٹھنا پڑتا لیکن بوڑھے ابا کی آواز مسلسل آتی رہتی جو باورچی سے باتیں کر رہا ہوتا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ذکیہ سنگار میز پر رکھی ہوئی خوشبوؤں سے جاوید کے کپڑوں کو معطر کر دیتی۔ اپنے ہاتھ جاوید کے کپڑوں پر پھیرتے وقت یہ بات صاف صاف طور پر اس کے سمجھ میں آجاتی کہ جاوید کے لیے اس کا پیار اس کے ہاتھوں میں سمٹ آیا ہے۔ کپڑوں پر وہ اس طرح خوشبو ملتی جیسے وہ اپنے آپ کو ہی سنوار رہی ہے۔

جاوید سج دھج کر آفس کے لیے تیار ہو جاتا تو وہ ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے دروازے تک جاتے۔ ذکیہ بڑی محبت سے جاوید کے ہاتھ دباتی۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ بالکنی سے ہو کر دروازے تک پہنچنے سے پہلے ابا جیسے راستے ہی میں انھیں لوٹ لیتا۔

"جادو ـــ جادو۔"

"ہم آ ہی رہے تھے ابا۔"

"میں تمھیں کہنے والا تھا کہ ڈاکٹر نے مجھے صرف سفید گوشت کھانے کے لیے۔"

"میں آج مچھلی بھجوا دوں گا ابا۔ یا پھر آپ کہیں تو مرغ، یا پرانس"

"پرانس ٹھیک رہیں گے۔ پرانس بالکل ٹھیک رہیں گے۔"

"لیکن جاوید، مجھ سے کھایا نہیں جا۔ اچھا ــــ پرسوں میں نے تھوڑی سی پڈنگ کھا لی تھی اور "شوگر" بڑھ گئی تھی۔ رات بھر میں سو نہ سکا۔ تم اس رات بھی حسب معمول دیر سے لوٹے لیکن مجھے پتہ نہیں ذکیہ نے کب دروازہ کھولا۔ تمہارے لیے دروازہ کھولنے کے لیے صرف وہ چوروں کی طرح چھپ چھپ کر جاتی ہے کہ کہیں میں جاگ نہ جاؤں۔ ذکیہ میرا بہت خیال رکھتی ہے جاوید ــــ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم اسے کبھی تکلیف نہ پہنچانا۔ میرے مرنے کے بعد بھی نہیں ــــ لیکن تم میرے لیے پرانس ضرور بھیجنا، کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے سفید گوشت ــــ"

"ہاں ابا ــــ میں آپ کے لیے پرانس ضرور بھیجوں گا۔"

"میں کل رات بالکل نہ سو سکا۔ میں نے جام کا ٹن صرف سونگھنے اور اس کا رنگ دیکھنے کے لیے منگوایا تھا۔ لیکن باورچی نے مجھ سے کہا کہ وہ بہت مزیدار ہے اور میں نے چکھا ــــ بہت تھوڑا سا ــــ چمچہ، دو چمچے، تین چمچے ــــ پر اس سے کیا ہوتا ہے ــــ چھ چمچے ہوں بھی تو کیا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ اور اب بھی مجھے چکر سا آرہا ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس پھر جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا ــــ اس سے کہہ دوں گا۔ ایسے ہی کہہ دوں گا کہ ــــ ہاں مگر تم پرانس میرے لیے ضرور بھیجنا۔"

"ہاں ابا ضرور ضرور ــــ" اور جاوید، جاوید ذکیہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل جاتا۔

بڈھا اب بھی باتیں کیے جاتا۔ وہ پکار کر ذکیہ سے کہتا۔ جاوید چاہے تو تم ادھر ہوتی جاتا۔ ذکیہ کبھی سنی ان سنی کر دیتی۔ کبھی کہتی ضرور آؤں گی۔ لیکن وہ کبھی بڈھے کے پاس نہ پھٹکتی۔ سچ پوچھیے تو بڈھا ذکیہ سے کچھ ایسا خوش بھی نہ تھا۔ جاوید کے سامنے ذکیہ کی تعریفیں وہ کرتا بھی تو ان تعریفوں میں مصلحتیں چھپی ہوتیں۔ کیونکہ ابا جانتا تھا کہ ذکیہ کی غیبت اور شکایت سے الٹے خود اسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے کئی بار اپنے بیٹے کو دیکھا تھا کہ وہ ذکیہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ محبت کی اس فضا میں ابا کے بغض و عناد کے کانٹوں کا بار آور ہونا مشکل تھا۔

جاوید چلا جاتا تو اس کے لوٹنے تک ذکیہ کو اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر میں بڑی کمی محسوس ہوتی۔ وہ کچھ دیر کے لیے اداس ہو جاتی۔ ہر چیز قرینہ سے اپنی اپنی جگہ دھری رہتی لیکن ذکیہ کو اس طرح الجھن سی ہونے لگتی جیسے گھر کا قرینہ تہس نہس ہو گیا ہو۔

اس کا عادتی تنہائی کا یہ غم جاوید کی شراب نوشی کے خیال سے ایک کڑوے درد میں بدل جاتا۔ وہ سوچتی کہ اسی شراب کے باعث وہ روزانہ کلب جاتا ہے۔ آفس کے اوقات کے بعد کئی گھنٹوں تک اسی شراب کی وجہ سے جاوید سے اس کو جدا رہنا پڑتا ہے۔ اور وہ جاوید کے ساتھ شام کی تفریح کے لیے ترس ترس جاتی ہے۔ اس کی سہیلیاں اس سے کرید کرید کر پوچھتی ہیں۔ کوئی اس طرح ہمدردی دکھاتی ہے جیسے اس کی اپنی زندگی سے بھی جاوید کا کوئی واسطہ ہے۔ اور یہ ساری باتیں اسے بہت کھلتیں جیسے کالونی بھر کے لوگوں کا بس

یہی کام رہ گیا تھا کہ اس کے زخموں کے یا تو لب سئیں یا پھر نمک چھڑکیں ۔ بس جس کسی کا جی چاہتا وہی غم خوار ہو جاتا ۔

جب جاوید رات گئے آتا تو وہ بالکل کوئی بات ہی نہ کرتا ۔ اس کی زبان بالکل کوئی بات ہی نہ کرتا ۔ اس کی زبان بالکل خاموش سی اس کے ہاتھوں کی حرکات وسکنات کا تماشہ کرتی ہے ۔ صبح کو بڑی نرمی سے ہاتھوں کو چوم کر جدا ہونے والا جاوید، رات گئے کیف و سرور کی ایک دنیا لیے ہوئے آتا اور ذکیہ کی زندگی کو راحتیں دے دیتا ۔ ایسی راحتیں جن کی جڑیں زندگی میں بڑی مضبوطی سے دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں ۔ اندر ہی اندر جو سطح سے نظر نہیں آتیں ـــــ بعض پاگل ان راحتوں کو جذبۂ حیوانی کا نام بھی دیتے ہیں اور محبت نقدس کا بہروپ عطا کر کے خوش بھی ہوتے ہیں ـــــ لیکن دن بھر جاوید کے لیے بے کل رہنے کے بعد رات کو ذکیہ آئینے کے سامنے پہونچتی تو اپنے حسن کو سو سو طرح سنوار کر خوش ہوتی اور تصور ہی تصور میں جاوید اس کو اپنی باہوں میں جکڑ لیتا تو صرف اس کی روح نہیں اس کے جسم کا رواں رواں اس کھٹ کھٹ کا منتظر ہوتا جو ابھی دروازے پر ہوا چاہتی ہے ۔

دن بھر گھر کے کام کاج میں ذکیہ کا دل بہل ہی جاتا ۔ کبھی اپنے اور جاوید کے لیے وہ سوئیٹر بنتی ـــــ کبھی بڈھے ابّا کے پرانے سوئیٹر کو رفو کر دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتی ـــــ جاوید کے لیے وہ روز ہی اپنے ہاتھ سے لنچ تیار کرتی اور بڑے چاؤ سے، بڑے جتن سے ہاٹ کیس میں رکھ کر اس کے لیے بھجواتی ۔ لنچ کے ساتھ کبھی کبھی وہ اسے ایک دو حرف لکھ بھی دیتی ۔

کب آؤگے، میں تو بس تمہارا انتظار بن کر رہ گئی ہوں ــــ

مجھے لکھنا کر آج میں نے بال کوری کیسی بنائی ہے ــ

کیا تمھیں لنچ پر میری یاد نہیں آتی ــ تمہارے اتنے بہت سارے دوست جو ہیں۔ کیوں یاد آؤں گی میں ــــ

پڑوس والی بیچاری رکھا چل بسی۔ جی بے سبب اداس ہو گیا ہے۔ تم ہوتے تو تمہاری باتیں اس گھٹن میں ہوا کے تازہ جھونکوں سے بڑھ کر تازگیاں عطا کرتیں۔

آج کھانا بھجوانے میں اکیس منٹ کی دیر ہو گئی ــــ تم مجھے معاف کر دوگے نا ــ قصور دار تمہارا ملازم ہے ــــ

آج تم آفس سے سیدھے اِدھر چلے آنا ــ تمہارے ساتھ گھومنے کو طبیعت کتنا چاہتی ہے۔

جاوید کچھ نہ کچھ جواب دے کر اسے رجھا لیتا۔ لیکن شام کو گھر لوٹنے کی اسے توفیق ہی نہ ہوتی ــــ حسبِ دستور پی پلا کر دس ساڑھے دس بجے تک گھر پہنچتا۔ اس کی آمد کا وقت قریب آتا تو ذکیہ ہر آہٹ پر کان لگائے اس کی منتظر رہتی ــ وہ چاہتی کہ وقت بہت تیزی سے گزر کر دروازے پر ہونے والی کھٹ کھٹ کو جالے لیکن وقت جیسے اتنا اداس، مضمحل، اور بوجھل ہو جاتا کہ اس کے قدم بڑی مشکل سے اٹھتے۔ اور ذکیہ اس طرح مرتے ہوئے وقت کے ہاتھوں مجبورِ محض ہو کر رہ جاتی۔

ابّا اکثر شام کی دو پیالی چائے پی کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھا جھینگروں

کی آواز میں کچھ گانے لگتا۔ کوئی ایسا مذہبی گیت جس کا آغاز موت کے خوف سے ہوتا ہے اور جو ختم ہونے تک زندگی ہی کا نوحہ بن جاتا ہے۔ وہ ایسا گیت اپنی عاقبت کے تصوّر میں پناہ لینے کے لیے گاتا۔ لیکن جب اسے اس تصوّر سے وحشت ہونے لگتی تو وہ ایک دم اس طرح خاموش ہو جاتا جیسے بجتے ہوئے ریکارڈ کی آواز ریڈیو پر سوئچ گھما کر یک لخت روک دی گئی ہو اور پھر اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے پکارتا۔

ذکیہ ____ ذکی بیٹی ____ لیکن اس وقت ذکیہ تصوّرات کی وہ دنیا آباد کیے ہوئے ہوتی جہاں بڈھے ابّا کے بیمار وجود کے لیے گنجائش نہ ہوتی۔ وہ ملازم سے کہلوا دیتی کہ "میں سو رہی ہوں - یا حمام کر رہی ہوں۔ یا مر گئی ہوں"

اپنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کا پردہ سرکا کر وہ اکثر بہتی ہوئی سڑک کا نظارہ کرنے کے لیے اداس اداس سی کھڑی رہتی ____ لیکن اسی کھڑکی سے جاوید کی آمد کا نظارہ کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ جاوید اس سڑک سے آتا تھا جس سڑک پر بڈھے ابّا کی کھڑکی کھلتی تھی ____ اگر اس کھڑکی تک ذکیہ پہنچ سکتی تو پھر اپنی آنکھوں کو بھی اسی کھڑکی کی طرح کھلی رکھ کر وہ جاوید کے آنے تک وہاں سے نہ ہٹتی۔ لیکن ابّا کی موجودگی میں اس کھڑکی تک پہنچنا کند چھری سے اپنا گلا آپ کاٹ لینے کے برابر ہے۔

کالونی کے اکثر جوڑے باہوں میں باہیں ڈالے پارک کی طرف جاتے ہوئے اُسے اپنی کھڑکی سے نظر آتے ____ وہ تصوّر ہی تصوّر میں جاوید کی باہوں

میں باہیں ڈالے خود کو پارک کی طرف جاتا ہوا دیکھتی۔ کھڑکی کے آگے سے گزرتے وقت کوئی سہیلی نظر اٹھا کر اشارے سے اُس کو بلاتی تو اسے محسوس ہوتا جیسے اس کی سہیلی اس کو بلا نہیں رہی ہے بلکہ طنز کے زہریلے نشتر لگا رہی ہے کہہ رہی ہے کہ جاوید کی مخالفت ساری کالونی نے کی تھی ___ لیکن تم تو اس کی ہر ادا پر مرتی تھیں ___ اب زندگی بھر کھڑکی کی کھڑکی گھوم کر راہ تکتی رہیہ۔ ایک ایک دریچے میں اپنی ہی نظروں کی سوئیاں چبھتی پھرو۔ اشارے سے بلانے والی سہیلی کا منشا وہ نہ ہوتا جو ذکیہ سمجھ لیا کرتی۔ لیکن اس کو ذکیہ پر ترس ضرور آتا۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی، کیسی خوبصورت اور زندہ دل لڑکی ایک بے رحم شرابی کے پلّے پڑ گئی ہے۔ لیکن اس کی سہیلی جو کچھ اپنے شوہر سے کہتی وہ ذکیہ کے کانوں تک نہ پہونچ پاتا۔ اور یہ ذکیہ کے لیے ٹھیک ہی ہوتا۔

کوئی سہیلی پھول والے سے پھول خریدتے خریدتے ہاتھ ہلا ہلا کر ذکیہ کو بلاتی ___ کوئی زیادہ منچلی ہوتی تو پکار پکار کہتی ___ ذکی پیاری آج میرے ساتھ گھومنے چلو نا ___ کبھی کوئی لڑکا کسی لڑکی کو شاپنگ کراتا پھرتا۔ ذکیہ جانتی تھی کہ یہ لڑکا اس لڑکی سے منسوب ہے۔ وہ قریب قریب ساری کالونی کو جانتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اُن محبّت بھرے بیتے ہوئے دنوں کی سہانی یادیں مجسّم ہو کر رہ جاتیں جو جاوید سے انہی سڑکوں، شاپوں اور پارکوں میں چھپ چھپ کر ملنے میں گزرے تھے۔ لیکن یہ دن بہت کم تھے بہت مختصر ___ اس لیے کہ ذکیہ جاوید سے ملی اور اس کی ہو گئی۔ جاوید ذکیہ سے ملا اور اس کا ہو رہا۔ پھر وہ بہت جلد وہ میاں بیوی بن گئے۔

جاوید نے فرقت کی آگ دیکھی اور نہ ذکیہ نے اس آگ کو اپنے دامن سے ہوا دی۔

جاوید نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ذکیہ کا دامن تھاما نہ ذکیہ نے جاوید کے آنسوؤں کی نمی اپنے دامن پر محسوس کی۔

دو موجیں بڑھیں، ملیں اور ایک ہو گئیں۔

اور ذکیہ کو اسی بات کا دکھ تھا کہ اس کے بیوی نہ بننے تک جاوید نے صرف ایک بار کہنے پر شراب چھوڑ دی تھی لیکن وہ اس کو حاصل ہو گئی تو سو سو طرح منتیں کرنے پر بھی وہ توجہ نہ دیتا اور بڑے ڈھنگ سے ذکیہ پر بوسوں کی بارش کر کے اس کا منھ بند کر دیتا۔

لیکن اب یہی محرومی ذکیہ کے سینے میں رہ بس کر ایک مستقل غم بن گئی تھی۔

ایک ایسا زخم جو محبتوں کی حفاظت کے لیے اپنی نرم نرم خلش کے ساتھ دل کے قریب ہی کہیں چپکے سے نمودار ہوتا ہے۔

جیسے کوئی پھولوں کو مسل رہا ہو۔

جیسے کوئی کچی کلیوں کو روند رہا ہو۔

جیسے کوئی گھنے سایوں کی ٹھنڈی فضا میں انگارے پھینک رہا ہو۔

جیسے کوئی اپنے بیٹے کی قبر پر سر جھکائے بیٹھا فاختہ کی آواز سن رہا ہو۔

لیکن جب جاوید رات کو دروازہ کھٹکھٹاتا تو ذکیہ کی ساری اداسیاں ساری محرومیاں، سارے غم، آہٹ پاتے ہی اس کو چھوڑ کر آس پاس ہی

کہیں بھاگ جاتے۔

ذکیہ ایک مجبوبہ کی طرح سیڑھیوں کی جانب بڑھتی۔

بالکنی سے اس طرح گزرتی جیسے اپنے ہی سائے سے بچ رہی ہو۔

اور پھر دو مضبوط باہیں اس کے پورے وجود کو جکڑ لیتیں۔ پھر اس کا جسم اپنی ساری حرارتیں، اپنے سارے احساسات، اپنی ساری گمبھیرتا کو ایک ہی مرکز پر سمیٹ کر اپنا سب کچھ ان دونوں کھلے ہوئے بازوؤں کو دے دیتی جو بڑی محنت اور بڑے پیار سے اس کی طرف بڑھتے۔

لیکن صبح ہونے پر ذکیہ پر اس بات کا ردعمل بہت مشدید ہوتا کہ وہ بغیر کسی مزاحمت کے ہر رات جاوید کو اپنا سب کچھ دے کر جہاں اس کے اور خود اپنے جنسی جذبے کی تسکین کا باعث بنتی ہے وہیں اپنے پندار کو مجروح کر لینے کا سبب بھی — اور شاید یہ نزاکت بھی اس سے پوشیدہ نہ تھی کہ رات کو جاوید کے خلاف احتجاج نہ کر سکنے میں اس کی اپنی کتنی کوئی کمزوری مضمر ہے۔ جس کا محاسبہ کرنے کی اس نے تکلیف ہی گوارا نہ کی۔

لیکن ایک رات اس نے قطعی طور پر یہ طے کر لیا کہ وہ جاوید سے کہہ دیگی کہ وہ شراب یا ذکیہ دونوں میں سے کوئی ایک شے چن لے۔

اور رات کو جب جاوید لوٹا تو دروازے پر اس کو لینے کے لیے کوئی نہ تھا۔ دروازہ بھائیں بھائیں کرتا کھلا پڑا تھا۔ جاوید نے دیوار کا سہارا لے کر سیڑھیاں طے کیں۔ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا، ابا کے کمرے کے آگے سے ہو کر گزرا — پھر ایک کونے میں ذکیہ کو دیکھتا پھرا۔ ملازم کو بیدار

کیا۔ وہ سیدھے ابّا کے پاس ___ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ سیدھے ابّا کے پاس پہنچا۔ وہ ابھی ابّا کے کمرے میں داخل بھی نہ ہوا تھا کہ ابّا نے بھینگروں کی آواز میں کہا۔" میں جانتا تھا۔ تم یہاں آؤ گے۔

" اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ذکیہ کہاں ہے۔

" اور مجھے یہ بھی تم سے کہنا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا ہے درست کیا ہو۔

" اور ___ اب تمھیں دونوں میں سے کوئی ایک چیز چن لینی ہوگی "

" شراب یا ذکیہ۔

" اور میں تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ یہ ذکیہ کا قطعی فیصلہ ہے۔

" ہاں۔ کیا تم اس بات سے واقف نہیں ہو کہ اسی شراب ہی نے میری صحت بھی تباہ کی ___ مجھے لوگوں کی نظروں سے گرایا۔ کیا میں تمھارے سامنے شراب کی بربادیوں کی زندہ مثال نہیں ہوں۔

جاوید بوڑھے باپ کا منھ تکتا رہ گیا تھا۔ اس کو تعجب ہو رہا تھا کہ ابّا میں آج برسوں پہلے کی رعونت کہاں سے عود کر آئی ہے۔ اس کے لہجے کی یہ خود اعتمادی اور رکھ رکھاؤ کس غیبی طاقت کا سبب ہے۔ وہ جو فقیروں کی طرح گڑگڑاتا تھا وہ شخص جس کو یہ راز معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی میں سوائے اس کی اپنی دلچسپی کے کسی اور کی دلچسپی شامل نہیں ہے۔ اور واقعی یہ زندگی کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ زندگی کے ہاتھوں زندگی کی یہ درگت بنے۔ اور یہی المیہ اس کا مقدر بن گیا تھا۔ لیکن آج ابّا کھوئی ہوئیں قوتیں جمع کر کے زندگی کی راہ پر واپس چلا آیا تھا تو جاوید اس کا منھ تک رہا تھا۔ وہ

سمجھ رہا تھا کہ یہ نئی قوتیں اس کو ذکیہ نے عطا کی ہیں۔ ایسی قوتیں جو اس احساس کا عطیہ ہوتی ہیں کہ اپنی زندگی ابھی دوسروں کے لیے کچھ کر سکنے کی اہل ہے اور اباّ اسی اہلیت اور اعتماد سے بات کر رہے تھے۔

جاوید نے لڑکھڑاتے ہوئے کرسی سنبھال لی۔

وہ بڑ بڑانے لگا "لیکن اس کو گھر سے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ یہاں رہ کر بھی تو مجھ سے سب کچھ کروا سکتی تھی"

اباّ کہنے لگا "اگر یہ ممکن ہوتا تو اب تک وہ تم سے سب کچھ نہ کروا لیتی"

"تو یوں کہو اباّ۔ اس کے اس فیصلہ میں خود تمھارا بھی ہاتھ ہے"

"مجھے ہاتھ یا پاؤں اڑانے کی ضرورت نہیں ہے جاوید ــــ میں نے کب تم دونوں کی زندگی میں دخل دیا ہے"

"پھر بھی تمھیں علم تھا تو تم اسے روک سکتے تھے"

"چلتی ہوئی آندھیوں کو کون روک سکتا ہے جاوید ــــ بڑھتے ہوئے طوفانوں کو کون روک سکتا ہے ــــ لو پڑھو اور بتاؤ کہ میں اسے روک سکتا تھا؟"

جاوید نے اباّ کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ لفافہ چاک کیا اور پڑھنے لگا۔

"تو تم اس کے ان سارے ارادوں سے واقف تھے"

"واقف تھا نہیں ابھی ابھی کرایا گیا ہوں"

"میں شراب چھوڑ دوں گا اباّ"

"شاباش، چھوڑ دو، چھوڑ دو، اسی وقت چھوڑ دو۔"

"لیکن کیا اب وہ نہیں آسکتی؟"

"تم نے خط پڑھ لیا نا — بھلا اب وہ کیسے آسکتی ہے۔"

"تو پھر تم میرا جواب کل اس تک پہنچا دینا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق ساری باتیں لکھ دوں گا۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن تم جا کہاں رہے ہو۔ بیٹھو ہیں ابھی تم سے بہت ساری باتیں کروں گا — ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ مجھے انناس کے ٹن۔"

مجھے اس وقت معاف کر دو ابّا۔ میں کل تم سے — میں انناس کا ٹن بھی کل لا دوں گا — اور جاوید نے ابّا کا کمرہ چھوڑ دیا۔

وہ پھر نیچے گیا — اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ خود ہی سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں طے کیں، بالکنی سے پاؤں دبا کر گزرا اور بڑے اطمینان سے بیڈروم میں پہنچ کر اس نے مدھم مدھم ہری روشنی کا بلب جلایا۔ کپڑے اتارے۔ اپنے جسم کا عکس آئینے میں دیکھا اور ذکیہ کے تکیوں میں منھ دے کر سسکیاں لینے لگا۔

صبح ہوئی تو وہ شراب چھوڑ چکا تھا۔

ذکیہ اب بڈھے ابّا سے دن میں ایک آدھ بار ضرور مل لیتی۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتی — اس کو کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے دیتی۔ کبھی ابّا

کو چاکلیٹ کی پیالی جیسی نعمت مل جاتی تو وہ ذکیہ کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے — "تم نے میرے بچے کو شیطان سے چھین لیا ذکی — چڑیل سے نجات دلائی تم نے میرے بچے کو۔"

اور وہ یہ کہتی ہوئی نکل جاتی — "نہیں ابّا یہ سب تم نے ہی تو کیا ہے۔ تمہیں نے تو مجھے بڑھاوا دیا۔ میری مدد کی۔"

اور بڈھا جھینگروں کی آواز میں گانے لگتا۔ کوئی ایسا مذہبی گیت جس کا آغاز موت کے خوف سے ہوتا ہے اور جو ختم ہوتے ہوتے زندگی ہی کا نوحہ بن جاتا ہے۔

وہ ایک دم چونک کر پھر پکارتا — "ذکیہ — ذکی بیٹی۔"

لیکن ذکیہ اپنی خوبصورت نئی دنیا میں مصروف ہو چکی ہوتی۔ شام کو آفس سے جاوید کی واپسی کے تصوّر ہی میں ذکیہ کا دن خوش خوش گزر جاتا۔ جاوید آفس سے گھر لوٹتا تو ذکیہ اس کے لیے بڑے اہتمام سے چائے تیّار رکھتی۔ اسے اپنے ہاتھ سے ضد کر کے کچھ نہ کچھ کھلاتی۔ وہ منھ ہاتھ دھو کر چائے پی چکتا تو اپنے ہاتھ سے اس کی ٹائی میں گرہ لگاتی — یہ گرہ اتنی اچھی سی ہوتی کہ جاوید گرہ لگنے سے قبل ہی اس کے ہاتھ چوم لیتا۔ پھر یہ دونوں گھومنے کے لیے نکل جاتے۔

ابّا پکار کر کچھ نہ کچھ فرمائش کر دیتا۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے میں بیری کھا سکتا ہوں۔"

اب ذکیہ کو وقت ہی نہ ملتا کہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر شام کے وقت

سڑکوں پر گھومنے والے جوڑوں کا تماشہ دیکھے اب تو وہ خود ہی انھیں، گھومنے پھرنے والوں میں جاوید کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کہیں شامل ہوتی۔
دونوں گھوم پھر کر لوٹتے تو جاوید بڑا تھکا تھکا سا نظر آتا۔
رات کا کھانا اب وہ ساتھ ہی کھاتے لیکن جاوید کچھ اس طرح دو چار لقمے زہر مار کرتا جیسے سزا بھگت رہا ہو۔ عجیب بے دلی سی اس پر چھائی رہتی۔ ذکیہ چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرتی۔ اِدھر اُدھر کے دلچسپ قصّے لے بیٹھتی۔ وہ اس طرح ہاں میں ہاں ملاتا جیسے دل ہی دل میں ان باتوں سے چھٹکارا پانے کے جتن کر رہا ہو۔ پھر ٹیبل ہی پر جماہیاں لینے لگتا۔ پھر کچھ اس طرح منٹ دو منٹ تک ہنسی مذاق کی باتیں کرتا جیسے فرض پورا کر رہا ہو۔ کوئی شے اس کی ان مسکراہٹوں کو جھٹلاتی ہوئی معلوم ہوتی۔ وہ سگریٹ سلگا لیتا۔ پھر ادھ جلا سگریٹ پھینک دیتا پھر ٹہلنے لگتا۔ پھر چپکے سے بستر پر لیٹ جاتا کروٹیں لیتا اور کروٹیں لیتے لیتے سو جاتا۔

ذکیہ دیر تک جاگتی رہتی۔ کبھی رنگ برنگے اون کے تانے بانے میں اپنی پتلی لمبی لمبی سلائیاں الجھائے وہ اس پھرتی سے اپنی مخروطی انگلیوں کو حرکت دیتی جیسے اپنے ہی ذہن کی گتھیاں سلجھا رہی ہو۔ سلائیاں رنگا رنگ اون کا حسین سا تانا بانا بنتی رہتیں اور اس کا ذہن احساسات اور تصوّرات کا ایک مہین سا جال اس کے خوبصورت وجود کے اطراف بنتا رہتا۔ اس کے اندر چھپی ہوئی محبوبہ بڑے سج دھج سے باہر نکل آتی اور اس کے سامنے ہی کھوئی ہوئی نگاہوں سے کچھ اس طرح بیٹھی رہتی جیسے اپنے چاہنے والے کی آمد کا منتظر ہو ــــ پھر دیکھتے

ہی، دیکھتے جیسے کواڑ بجنے لگے۔

اور ذکیہ کے سامنے بیٹھی ہوئی تجویبہ ایک چھپاکے سے بالکنی کی طرف لپکی اور بالکنی تک پہنچتے پہنچتے وہ پنجوں کے بل اس احتیاط سے چلنے لگتی جیسے خود اپنے ہی پیروں کی آہٹ بھی اسے گوارا نہ ہو۔ پھر وہ مضبوط باہیں اسے تھام لیتیں۔ پھر وہ کھلے ہوئے، ترستے ہوئے ہونٹ اس تجویبہ کے پیاسے ہونٹوں کی طرف بڑھتے اور ان کی سلائیوں اور ذکیہ کی مخروطی انگلیوں کی جنبش رک جاتی۔

"یہ میں ہوں۔ یہ میں ہوں۔ جو اب بھی جاوید کا انتظار کر رہی ہوں۔ لیکن اب مجھے کیا چاہیے ـــــ جاوید اطمینان سے اپنے بستر پر سو رہا ہے۔ پھر مجھے کس کا انتظار ہے ــــ یہ سب کچھ کیا ہے ــــ یہ کیسی کمی ہے ــــ یہ کیسا درد ہے ۔"

اور ذکیہ نے ان کے رنگا رنگ گولے صوفے پر پھینک دیے۔ پیرو پاکیزہ اسی طرح جاوید کے لیے کواڑ کھولنے جاتی تھی ـــــ وہ سو رہا تھا۔

لیکن ذکیہ کو ایسا لگا کہ جاوید کی نیند ایک ایسے مسافر کی نیند ہے جو سب کچھ لٹا کر رہزنوں سے بے خطر ہو گیا ہو۔

کیا جاوید اپنی خوشیاں لٹا کر سو رہا ہے؟

اور کیا سب کچھ پالینے ہی کی خوشی میں تم سے تمہاری نیند چھن گئی ہے؟

وہ ابھی جاوید کے چہرے سے نظریں بھی نہ ہٹا سکی تھی کہ اس کو محسوس ہوا جیسے کواڑ بج رہے ہوں۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

اب اگر کبھی جاوید، ذکیہ کی طرف التفات کرتا بھی تو اس التفات میں نہ تو جذبات کی وہ شدّت اور فراوانی ہوتی جو امڈ امڈ کر جھوم جھوم کر چھانے والے بادلوں کی کیفیت کے مترادف ہو ـــــ نہ ذکیہ کے جسم سے وہ شرارے ہی پھوٹتے جنھیں مسرّت کے پھول کہا جا سکتا اور نہ ہی اس کو اپنے جسم کے ہر حصّے پر پھول کھِلتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اب خود اس کی اپنی آنکھیں بھی اپنے ہی بدن کی اس رعنائی سے محروم ہو گئی تھیں جس کو کبھی جاوید سانس لیتی ہوئی چاندنی کا نام دیتا تھا۔

"تمھارا بدن ایک سانس لیتی ہوئی چاندنی ہے ذکی جس میں میرا وجود ڈوب ڈوب کر ابھر رہا ہے۔"

اور اس سانس لیتی ہوئی چاندنی پر وہ امڈتے اور جھومتے جھامتے بادل کی طرح چھا جاتا۔

ایک رات اس نے شب خوابی کا لباس پہنتے پہنتے خود کو سر سے پیر تک آئینے میں دیکھا ـــــ پھر اس نے اپنا لباس دور پھینک دیا اور ہر زاویے سے اپنے بدن کو دیکھتی رہی ـــ پھر تصور ہی تصور میں اس کو جاوید نے چوما۔ بال پیشانی، آنکھوں، ہونٹوں اور پیر کی انگلیوں تک اس کے بدن پر شگوفے کھلنے لگے ـــــ پھر کسی نے محسوس کیا جیسے میں جکڑ لیا ـــ پھر اس نے محسوس کیا جیسے وہ کیف و سرور کے دریا میں بہی جا رہی ہے۔

اس نے اپنی مخروطی انگلیوں سے سوئے ہوئے جاوید کے گھنے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر اپنی سانس کا عطر اس نے جھک کر جاوید کے چہرے پر چھڑک دیا۔

جاوید نے بے نیازی سے کروٹ لی اور وہ اس کے سرہانے پلنگ کے پیچھے اس طرح چھپ گئی جیسے خود نہیں چھپ رہی ہو بلکہ اپنے سینے کے اندر مچلتی ہوئی ایک دنیا کو چھپا رہی ہو۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

اس کے اندر کی دنیا باہر کی حقیقتوں سے ٹکرا اٹھی اور اس کی ساری ہستی جیسے لمحے بھر کے لیے ڈول گئی۔

اس نے محسوس کیا جیسے جاوید سو نہیں رہا ہے، وہ تو دروازے پر کھڑا اس کی اپنی ذکی کا منتظر ہے۔

اس نے پھر جاوید کو دیکھا۔ وہ بستر پہ بے خبر سو رہا تھا۔ بیڈ لیمپ کی ہری روشنی اس کے چہرے کو اس وقت بھی نکھار رہی تھی جبکہ اس نے روز کی طرح آج شیو بھی نہیں کیا تھا۔

اس نے اپنی مخروطی انگلیاں پھر جاوید کے گھنے بالوں میں پیوست کر دیں۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

کوئی پھر دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا

اس نے چونک کر اپنے ہاتھ جاوید کے گھنے بالوں سے اس طرح ہٹا لیے جیسے چوری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہو۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ

کسی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔

وہ اپنے تصورات کی دنیا سے ایک ہی جست میں حقائق کی اس دنیا میں لوٹ آئی۔ اس کو سب کچھ یاد آگیا۔ یہ سعید ہوگا۔ اس کے اپنے جاوید کا چہیتا بھائی۔ اس کا اپنا کھلنڈرا اور شریر دیور۔ جو کالج سے چھٹیوں میں آیا ہوا تھا۔ جو اس سے کہہ گیا تھا کہ سکنڈ شو دیکھ کر وہ آج رات گئے واپس لوٹے گا۔ اس نے ملازم سے کہہ دیا تھا کہ وہ بڑھے ابا کے کمرے کے سامنے سو رہے تاکہ سعید میاں آئیں تو دروازہ کھول سکے۔

اس نے تھکی ہوئی بوجھل آنکھوں سے کمرے کے باہر دیکھا۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

اس نے اپنے بدن کی چھٹکی ہوئی چاندنی کو شب خوابی کے لباس میں جلدی سے چھپا لیا اور اس کے قدم بالکنی کی طرف اٹھ گئے تاکہ ملازم کو جگا سکے۔

بالکنی سے گزر کر وہ اس طرح سیڑھیوں کی جانب بڑھی جیسے اپنے ہی سائے سے بچ رہی ہو اور سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے اس کا سایہ بھی چپکے سے اس کو چھوڑ کر دیوار کی اوٹ میں اس طرح جا چھپا جیسے اس کی واپسی پر اس کی ساری ڈھکی چھپی تمناؤں، دبے دبے جذبوں اور سہمی سہمی خوشیوں سمیت اس کو دبوچ لے گا۔

ملازم اپنی دن بھر کی محنتوں کا پھل نیند کی صورت میں وصول کر رہا تھا۔

اس نے ملازم کو جگایا نہیں ـــ

اس نے خود بڑھ کر دروازہ کھولا اور لمحے بھر کے لیے سڑک کی آوارہ روشنی کرن کرن بن کر اس طرح اس کے دروازے میں در آئی جیسے سینے میں راز ہائے سربستہ۔ اور پھر دو مضبوط باہیں اس کے سارے وجود کو جکڑ لینے کے لیے آگے بڑھیں۔

"ذکی مجھے اپنا لو" اس کی زبان میں جیسے لکنت تھی لیکن اس کی لغزش
پا نے خود اس کو سہارا دیا۔
"تم — میں تمھاری ذکی نہیں ہوں" ذکیہ دیوانوں کی طرح اس کی چھلکتی
ہوئی آنکھوں کو دیکھتی رہی۔
"میں تو تمھارے — میں تو تمھارے —" چھوڑ دو مجھے — مجھے چھوڑ دو"
لیکن دو کھلے ہوئے بازوؤں نے اُس کو جکڑ لیا۔
اس نے اپنی ساری حرارتیں۔ اپنی ساری قوت، اپنے سارے ارادوں
کو ایک ہی مرکز پر سمیٹ کر ایک ہی تڑپ میں اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا۔ لیکن
ان مضبوط باہوں نے اسے پھر سہارا دیا۔
"ذکی ضد نہ کرو — میں تمہاری پیاسی آنکھوں کے پیام پڑھ چکا ہوں ذکی۔
اور... اور.... پھر شرارے پھول بننے لگے۔
لیکن بالکنی نے اس بار اس کے سائے کو کسی مضبوط و توانا سائے کے ہاتھوں
مجبور محض بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھتا ہوا نہیں دیکھا۔
بالکنی کی مدھم روشنیوں نے اس کے سائے کو پھر کبھی دیکھا ہی نہیں۔
صبح ہوئی تو سیڑھیوں کے نیچے کا دروازہ بڈھے ابا کے کمرے کے دروازے
کی طرح بھائیں بھائیں کرتا کھلا پڑا تھا۔

دوسرے دن رات گئے جاوید واپس آیا تو دروازے کی کھٹ کھٹ

سُن کر بڈھے ابّا نے کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔
سڑک کی آوارہ روشنی کرن کرن بن کر اس طرح دروازے میں در آئی
جیسے کسی بیوا کے محرم کے بند کھل گئے ہوں۔
رات کے اٹوٹ سنّاٹے میں جاوید کی آواز فضاؤں میں تیرنے لگی۔
"کون ہو تم ـــــ جاؤ خود کو اپنے کمرے میں بند کر لو۔"
اور جاوید کی آواز کے نیچے بوڑھے ابّا کی سسکیاں دب دب گئیں۔
کوئی دیوانہ رات بھر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔
کھٹ، کھٹ، کھٹ، کھٹ، کھٹ، کھٹ۔
لیکن کوئی ذکی اپنے کسی جادو کو لینے کے لیے نہیں آئی۔

— —

مسدود راستے

اس سڑک کے چوڑے چکلے سینے سے میرے قدموں کی چاپ کا وہی تعلّق ہے جو میرے اپنے سینے سے میرے دل کی دھڑکن کا۔ فرق ہے تو بس یہی کہ میرے سینے میں صرف ایک دل ہے اور اس سڑک کے چوڑے چکلے سینے میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دل قدموں کی چاپ کے سہارے اس کے اپنے دل بن گئے ہیں۔

اس سڑک کا کشادہ سینہ کچھ ہی دنوں پہلے تک ایک اور چاپ کا رازداں تھا۔ لیکن اب وہ چاپ کہیں کھو گئی ہے۔ یہ ایک بارہ سالہ لڑکے کے قدموں کی چاپ تھی جو اس سڑک کے بے شمار دلوں میں سے ایک ننھا سا دل تھا، جو تین دن کی چھٹیوں کا تصوّر ذہن میں لیے اپنے اسکول سے خوش خوش

گھورتا لیکن یکایک اس کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا اور سڑک نے اس کے قدموں کی چاپ پھر نہیں سُنی۔

میں کینڈل کالونی سے نکل کر نسبتاً لمبا چکر کاٹتا ہوا اسٹینلی گرلز اسکول سے اسٹیٹ بینک کی عظیم عمارت کے پہلو میں پہنچتا ہوں اور اس عمارت کے سائے میں پہنچ کر اپنی تہی دستی کے باوجود جب اس عمارت سے زیادہ خود اپنے عظیم ہونے کا احساس ذہن میں سر اٹھاتا ہے تو خالی جیبوں کو بھول کر سرفراز گزر جاتا ہوں۔

ایک اور سیدھا سادا راستہ بھی ہے جو ٹیل غلادر ہائی اسکول اور معین کرانہ اسٹورس سے ہو کر جان کمپنی کے بالکل مقابل میں اسٹیٹ بینک کی طرف مڑ جاتا ہے جو ہمیں بائبل کی اس دوکان سے ہو کر لے جاتا ہے جیسے کہ کوئی روشن زیشانی چلاتا ہے جو یہاں مقامی شاعر (LOCAL POET) کے خطاب سے پکارا جانے پر فخر محسوس کرتا ہے لیکن میں نے یہ راستہ اپنے پر بند کر رکھا ہے — میری بیٹی کی دعاؤں کے لیے جب تک رب کریم کا باب اجابت وا نہ ہوگا یہ راہ بھی میرے لیے مسدود رہے گی۔

انسانی زندگی کا تعلق اسٹیٹ بینک، اسکول اور بائبل کی دوکان سے پہلے کرانہ اسٹورس سے ہے اور اسی لیے نہ میں اسٹیٹ بینک کا مقروض ہوں، نہ بائبل کی دکان کا — اپنے بچے کی فیس، اسکول میں کبھی کبھی قرض ہو جاتی ہے تو کسی نہ کسی طرح ادا بھی کر دیتا ہوں۔ اس قرض کی میعاد ظلم کی میعاد کی طرح طویل نہیں ہوتی؛ لیکن معین کرانہ اسٹورس کی قرض کی میعاد بڑی طویل ہے

کوئی سال بھر سے میں نے یہ راستہ اپنے پر بند کر رکھا ہے۔ مظلوم میں ہوں یا کرانہ اسٹورس کا مالک جس کا غلّہ میں نے اور میرے افرادِ خاندان نے زندگی کی ضرورت جان کر استعمال کر لیا ہے، فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ معاملہ صرف سو روپے کا ہے۔ ان سو روپیوں کی ادائیگی میرے لیے اتنی کٹھن ہو گئی کہ میں نے خود پر کتنے ہی راستے کھول لیے اور کتنی ہی راہیں بند کر لیں، اور یہ راستے کھول لینے سے راستے بند کر لینے تک کا جو جذباتی ردِّ عمل ہے اس سے میرے ملک کے نیتا قطعی واقف نہیں ہیں۔

یہ لوگ اس سے نابلد بھی نہیں ہیں کہ وہ ضرورتیں جو پوری ہی نہیں ہو سکتیں ان کے گھٹنے اور بڑھنے کا کیا سوال، لیکن وہ یہ نعرہ دانستہ لگاتے ہیں۔ کسی فرد کی زندگی کی ضرورت کسی راج بھون کے ڈنر کا مینو تو نہیں ہے کہ وہ لوازمے گھٹا کر سانڈ پر گورنر کے جذبۂ حب الوطنی کو مطمئن کر دیا جائے۔ لیکن ہٹائیے بھی، یہ باتیں میری زندگی کے نئے نئے راستوں میں میرا زادِ سفر تو نہیں۔

لیکن غضب تو جب ہوا جب میں نے دوسرا راستہ بھی اپنے پر بند کر لیا اور یہ راستہ تو صرف تیس روپیوں کے لیے میرے قدموں کے نیچے سے کھسک گیا۔

شیو پال مسلمان آدمی ہے، میرے راستوں کے مسدود ہونے میں کسی مسلمان آدمی اور کسی ہندو آدمی کی کوئی تخصیص نہیں ہے، مجھے صرف آدمی سے غرض ہے جو میری راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔

شیو پال کی مسلمانی کا تذکرہ مجھے یوں کرنا پڑا کہ اس کا نام رحمٰن اور اس

کی بیوی کا نام آمنہ ہے۔ شیو پال تو کوئی اور ہی شخص تھا جو کبھی اس چھوٹی سی دکان کا مالک تھا اور جس کا کاروبار اتنا چمکا تھا، کہ اس نے قلب شہر میں کہیں بڑی سی دوکان کر لی تھی اور اپنے نام کی رائلٹی رحمٰن سے وصول کی تھی، جو رقم ادا کرنے کے بعد خود شیو پال بن بیٹھا تھا۔

اس شیو پال نما رحمٰن کا کاروبار بھی اتنا چمکا کر اس نے اپنے چھوٹے بھائی سبحان کو ایک اور دوکان کھول دی جو میرے راستے میں نہیں پڑتی تھی۔

شیو پال، کالونی کے شریفوں کو ضرورت کی ہر چھوٹی بڑی شے یا تو رجسٹر میں کھیتا دی کر کے دے دیتا یا ان کی تحریر لے کر۔ کینڈل کالونی کے شریفوں میں اس نے میرا نام سرفہرست اس لیے رکھا تھا کہ میں نہ بڑے آدمیوں کی طرح اکڑتا تھا نہ چھوٹے آدمیوں کی طرح گھگھیاتا ــــ گھڑی دو گھڑی دوکان پر رک کر چلتا چلتا خیریت پوچھ لیتا۔ آمنہ چائے کی پیش کش کرتی تو دوکان پر کھڑا کھڑا شکریہ ادا کر کے مزے لے لے کر چائے پی لیتا۔ دارجلنگ سے راست منگوائی گئی چائے کی پتی کی تعریفیں کرتا تو شیو پال اور مسز شیو پال پھولے نہ سماتے تھے۔

میرا سماجی موقف گویا اتنا مستحکم تھا کہ مسز شیو پال کی یہ پیش کش قبول کر کے میں اس کی اپنی نظروں میں اور دیگر تمام گاہکوں کی نظروں میں جیسے شیو پال کے خاندان بھر پر احسان کرتا اور انہی میرے احسانات نے جب مجھے شیو پال کا تیس روپے کا مقروض کر دیا، تو میں نے مارے شرم کے رقم کی ادائیگی تک کے لیے یہ راستہ بھی اپنے پر بند کر لیا تھا۔

اب میرے لیے بڑی مشکل ہو گئی تھی۔ گھر سے دفتر تک پہنچنے کے لیے

میں زندگی کے بڑے لمبے فاصلے طے کرتا۔ سیمنٹ روڈ پر اس طرح قدم رکھتا جیسے نوکیلے پتھروں پر چل رہا ہوں۔ میرے پیر زخمی ہو جاتے۔ میرے احساسات بھی مجروح، آپ نے احساسات کی یہ جراحیت کا ہے کو محسوس کی ہوں گی جو راہیں مسدود ہونے اور سیمنٹ روڈ کے پتھریلی ناہموار سڑک بن جانے کا باعث ہوتی ہیں، اور جن پر آدمی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چلتا ہے جیسے اس کو صرف وہی راستہ دکھائی دے رہا ہو جس سے وہ بھاگتا پھر رہا ہے۔

شیو پال، معین الدین، موہن سنہا، قلندر خاں اور نیو امبیسی کیفے کا حسین سنیٹھو ـــ کیسے کیسے مرحلوں سے گزرنا ہوتا۔ موہن سنہا تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ گریجویٹ ہے۔ میں اس کا جنم جنم کا مقروض ہوں، اس کے دادا نے میرے دادا کو حویلی میں پہنچ کر نرم گرم ایرانی قالینوں پر قرض دیا۔ اس کے باپ سے میرے ابا نے اپنا موٹر روک کر قرض لیا۔ میں نے بھی چلتے چلتے سائیکل موہن سنہا کی دوکان کے پٹ سے لگا کر کھڑی کر دی۔ کیونکہ اس میں اسٹینڈ نہیں تھا اور موہن سنہا سے گرم پتلون کے لیے وولن رسٹڈ قرض لے لیا۔

کپڑوں سے بھری ہوئی اس کی دکان سے جب صرف ڈیڑھ گز کپڑا کم ہو گیا تو بڑے ٹھسے اور تمکنت سے میری ستر پوشی ہوئی۔ وسٹڈ قرض کی ہو کہ مانگے کی، وسٹڈ ہوتی ہے ـــ خریدی ہوئی معمولی چیک کی پتلون آپ کی راہ میں کانٹے تو نہیں بچھاتی لیکن دیکھنے والے راہ گیروں کی آنکھوں میں کھٹکتی ضرور ہے۔

وسٹڈ کی بات بالکل مختلف ہے۔ وسٹڈ کی پتلون میں چھپی ہوئی

ٹانگیں اگر سوکھ کر ٹھنٹھ ہو گئی ہیں تو بھی مضائقہ نہیں چاہے ان ٹانگوں کا سارا گودا پگھل کر کبھی کا بہہ چکا ہو، لیکن آپ نے وشدکا غلاف چڑھا دیا ہے تو پھر راہ چلتے لوگ نظروں ہی نظروں میں پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ اور میں نے جب یہ غلاف چڑھا لیا تو وہ راستہ اپنے پر بند کر لیا جو مجھ جیسے ہر راہ گیر کو طوعاً و کرہاً موہن سنہا کی دوکان تک لے جاتا تھا۔ یہ راستہ میرا راستہ تھا جو میں نے خود پر بند کر لیا تھا۔ اور اس طرح میرے اپنے گھر سے میرے دفتر تک تین راہیں میرے لیے مسدود ہو گئی تھیں۔

قلندر خاں اور نیو اسپیسی کا حسین سیٹھ تو ایسے دربان تھے جو شہر کی فصیل کے صدر دروازے پر کھڑے راستہ روک لیتے تھے۔ میرا ان دربانوں سے بچ کر اپنے دفتر کے حدود میں داخل ہونا بہت کڑا مرحلہ تھا۔ اسی لیے میں نے ان سے اقساط پر تصفیہ کر لیا تھا، بلکہ یوں سمجھیے کہ خود ان لوگوں ہی نے مجھ سے اقساط پر تصفیہ کرنے کے لیے اپنی عافیت جانی لیکن فصیل کے ان دربانوں تک پہنچنے کے لیے اب صرف ایک ہی راستہ میرے لیے رہ گیا تھا۔

یہ راستہ میرے لیے سب سے زیادہ کٹھن تھا۔ اس راستے سے ہو کر گزرنا کسی طرح بھی میرے بس کی بات نہ تھی۔ اس راستے پر کوئی میرا بہت دور تک پیچھا کرتا تھا۔ وہ میرے انتظار میں جیسے وہاں نکڑ پر کھڑا رہتا اور اگر میں اُسے مل جاتا تو دوڑ کر میرے سینے سے چمٹ جاتا۔ وہ لمحے میرے لیے قیامت سے کم نہ ہوتے۔ جب میرا تعاقب کرنے والا یہ بارہ سالہ لڑکا میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیتا۔ میں اس کا چہرہ تکتا رہ جاتا۔ میں سو بار مر مر کر جی اٹھوں، تب بھی تمھارا

قرض کیسے ادا ہو سکتا ہوں، تم تو جہاں بھی ہو میرا راستہ روک سکتے ہو۔ میں ٹکر
ٹکر اس کا منھ تکتا رہتا اور وہ آہستہ آہستہ میری خشک آنکھوں میں نمی بن کر گھلنے
لگتا۔ پھر خون کی بوند بوند بن کر میرے دل میں اترتا۔ پھر نشتر بن کر نس نس میں
ٹوٹنے لگتا۔ اس لڑکے کا قرض مجھ پہ میرے اپنے وجود کا قرض ہے۔

آپ نے پہچان لیا ہوگا، یہ وہی بارہ سالہ لڑکا ہے جس کے متعلق میں
نے پہلے بتایا ہے کہ وہ تین دن کی چھٹیوں کا تصور ذہن میں لیے اپنے اسکول
سے خوش خوش گھر لوٹا لیکن یکایک اس کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا اور سڑک
نے اس کے قدموں کی چاپ پھر نہیں سنی ــ اور یہ راستہ میرے اسی ننھے قرض
خواہ کے اسکول کی وسیع عمارت کے سامنے سے ہو کر میرے اپنے دفتر کو جاتا ہے۔
اس لڑکے نے میرے اپنے کندھوں پہ میری اپنی ہستی کا بوجھ رکھ دیا ہے۔

میں تو یہ سوچا کرتا کہ جب وہ میرے برابر کا ہو کر میرے ساتھ ساتھ
چلے گا تو زندگی کے کتنے ہی کٹھن راستے ہمارے لیے سہل ہو جائیں گے،
میں نے اس لڑکے کو ٹوٹ کر چاہا ہے، میں نے اپنے ذہن پر اپنے دل پر
یہاں تک کہ اپنے مزاج پر اس لڑکے کی گرفت محسوس کی ہے لیکن اس کے
باوجود، میں نے اس کو کچھ نہیں دیا۔

اس نے کتنی منتوں سے امتحان میں پاس ہو کر مجھ سے گھڑی حاصل
کی، جو کچھ ہی دنوں بعد بقول اس کے "اسٹار اینڈ کو" میں محفوظ ہو گئی یعنی
سیٹھ تاراچند کے پاس رہن ہو گئی۔ پھر اس نے مجھ سے ایرگن کا وعدہ لیا اور
دوسرے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اپنی بے

بضاعتی اور تہی دامنی پر میں شرم محسوس کرتا، اس نے مجھے اس آزمائش میں مبتلا ہی نہیں کیا اور ہنستا کھیلتا کہیں جا چھپا۔

مجھے کیا خبر تھی کہ اس کے پاس وقت اس قدر کم ہے، لیکن کوئی خوف میرے دل کے گوشوں میں سہما سمٹا ضرور تھا۔ ایک جنگ سی میرے ایقان اور واہمے کے درمیان جاری تھی ــــــ جانِ پدر تم راستہ چلتے چلتے میرا ساتھ چھوڑ دو گے ــ نہیں ــ بالکل نہیں ــ میں کسی وہم کا شکار ہو گیا ہوں ۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتا۔ واہمہ بصیرت کی موت ہے۔ اور میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اس کا تنومند نوجوان کا روپ دے دیا۔ میں نے تصوّر ہی تصوّر میں اس کو کتنی ہی بار سہرا باندھا۔ دولہا بنا کر سینے سے لگا لیا، لیکن جانے کیوں یہ خیالی پیکر ہمیشہ دھندلا دھندلا ہی رہا۔ میں نے اس دھند پر کتنی ہی بار وہ جھنجھلاہٹ محسوس کی۔ تصوّر اتنا دھندلا کبھی تو نہیں ہوتا۔ خیالی پیکر اس طرح مٹے مٹے کبھی تو نہیں ہوتے۔ پھر یہ سب کیا ہے ــــ وہی خوف نہاں خانہ دل سے پھر سر اٹھانے لگتا ــــ جانِ پدر! تم راستہ چلتے چلتے میرا ساتھ ــ نہیں ــ بالکل نہیں ــــ یہ واہمہ ہے، اور واہمہ بصیرت کی موت ہے لیکن جب کھیلتے کھیلتے اس کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی تو دو چار دن بعد میں اس کے ساتھی کو وہ نوٹ بک لوٹانے کے لیے اس کے اسکول کے احاطے میں داخل ہوا جو اس نے امتحان کی تیاری کے لیے نوٹس لینے کی خاطر اپنے ہم جماعت سے حاصل کی تھی۔ تو میں نے محسوس کیا کہ بصیرت آپ اپنی موت مر گئی ہے اور واہمہ مسکراتا کھڑا ہے، کہہ رہا ہے، تم نے پہچانا نہیں، میں ہی

توبصیرت تھا۔

صبح جھکی تو میں شام کے تصوّر میں سرگرداں رہا۔ شام آئی، جھک کر اپنی چادر میں دنیا بھر کے سمیٹ لیا تو میں بھی اپنی تنہائیوں کو گوشۂ دل سے نکال کر سینے سے لگاتا رہا۔ اس درد کی کسک کم کم گھلتی رہی، فزوں تر بھی۔ جو بیتنا تھی مجھ پر بیتی ____ نہ میں ٹھہرا نہ وقت رکا۔

لیکن یہ راستہ میں اپنے لیے کھلا نہ رکھ سکا۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ میں مدرسۂ عالیہ کے اس احاطے میں داخل ہوا ہوں۔ دنیا کی نظر بچا کر چوروں کی طرح اس بارہ سالہ لڑکے کے ساتھ احاطے بھر میں گھومتا پھرا ہوں۔ دیوار پر اس کا نام لکھا ہے، درختوں پر اس کا نام کھدوا ہے، یہاں اس سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ یہاں وہ انٹرول میں کھانا کھایا کرتا تھا۔ یادوں کی انجمن سجا کر میں نے زمین پر رکھی ہے، دیپ جلائے ہیں، چراغاں کیا ہے، پھر اس انجمن کو چپکے سے اٹھا کر میں نے دل میں چھپا لیا ہے اور اسکول کے احاطے سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں آگیا ہوں جہاں شیو پال، معین الدین موہن سنہا، قلندر خاں اور نیو امبیسی کا حسین سیٹھ میرے منتظر ہیں۔

مجھے بہرحال اسی دنیا میں سانس لینا ہے جس دنیا میں اوپر بتائے ہوئے میرے سارے ساتھی دنیا کا روبار چلاتے ہیں۔ میں صرف اسی حد تک بھی اپنے پر قادر نہیں ہوں کہ ان رستوں سے نہ گزروں جن راستوں پر مجھے ان کی مزاحمت کا خدشہ ہو۔ مجھے بہرحال انہی راستوں سے گزرنا ہے، کبھی نظر چرا کر، کبھی دامن بچا کر، کبھی سائیکل دوڑاتا ہوا ہواؤں کے دوش

پر سوار ہو کر کہ کوئی دیکھ بھی لے تو روک نہ سکے۔ کبھی پو پھٹتے سمے، کبھی رات ڈھلے۔ کبھی دکانیں کھلنے سے کچھ ہی قبل، کبھی کاروبار بند ہونے کے کچھ ہی بعد کبھی میں زندگی کے پیچھے چلا ہوں، کبھی زندگی میرے پیچھے۔ کبھی زندگی نے پنڈ چھڑا کر فرار ہونا چاہا ہے تو انھیں راستوں پر میں نے اس کا تعاقب بھی کیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے پاس سے کبھی کبھی اس طرح بھی گزر گئے ہیں، جیسے اجنبی ہوں، یا پھر میں نے زندگی کو پہچاننے کی کوشش کی بھی تو اس نے منھ پھیر لیا۔

یہ سب کچھ ہوا ہے، ہوتا رہتا ہے، جانے کب تک ہوتا رہے گا —— لیکن اسکول کے اس راستے پر میرے قدم اٹھ ہی نہیں سکتے۔ اس راستے سے گزرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میں نے زندگی کے دوسرے راستوں کو اس راستے سے ملنے ہی نہیں دیا ہے۔ میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ اس لڑکے کا قرض مجھ پر میرے اپنے وجود کا قرض ہے۔ سو میں نے یہ راستہ اپنے پر خود ہی بند کر رکھا ہے۔

ایک دن مگر ایک بات ہوئی۔ میں آنے والے خطرے کی آہٹ پا چکا تھا۔ حسین سیٹھ کو بہت سمجھایا، منایا، لیکن وہ نہ مانا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا "تم قسط بھی پابندی سے نہیں دیتے ہو، آج پہلی تاریخ ہے، سارا قرض یکمشت چکا دینا ہوگا، ورنہ تم اپنے دفتر سے باہر نہیں جا سکوگے۔ مجھے اپنی عزت کا پاس تھا۔ یہی ایک چیز جسے آج تک زمانے کے دست برد سے بچا سکا تھا۔ حسین سیٹھ آج اسی کا در پے تھا۔ زندگی کی گاڑی قرض کے پہیوں پر چل تو سکتی ہے،

لیکن عزت کی عمارت قرض کی اینٹوں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ میں نے گردن جھکا لی، اثبات میں سر ہلایا، شام ہوتے تک میں نے تنخواہ حاصل بھی کر لی اور پھر ان قرض خواہوں کے حوالے سب کچھ کر دیا جو جیسے پھر زندگی کی گاڑی ڈھکیلنے والے تھے۔ میں لٹ چکا تھا، میری جیب میں صرف تین روپے اکتیس پیسے رہ گئے تھے۔ لیکن حسین سیٹھ ۔۔۔ وہ میرے دفتر کی عمارت کے بالکل مقابل اپنے ہوٹل میں بیٹھا مجھے تاک رہا تھا، لیکن میں نے بھی خود کو دفتر ہی میں چھپائے رکھا، سب ساتھی چلے گئے، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ سورج کی کرنیں بھی جانے لگیں، اندھیرے میرے رفیق ہیں ۔۔۔ سچ پوچھیے تو اندھیرے ہر غم کے رفیق ہوتے ہیں، ہر دکھ کے، ہر درد کے، اندھیروں میں جب زندگی دھندلانے لگتی ہے تو درد چمک اٹھتا ہے۔

میں اپنے جسم کو چوروں کی طرح چھپا کر دفتر کے گیٹ تک لے آیا لیکن سڑک پر پھیلی ہوئی روشنی میں مجھے حسین سیٹھ نے دیکھ لیا۔ اس نے مجھے پکارا۔ میری روح کی پہنائیوں نے اس کی آواز سنی لیکن میں نے اپنے جسم کو اچھال کر پاس سے گزرتے ہوئے رکشا میں پھینک دیا۔

حسین سیٹھ سائیکل پر سوار ہو کر میرے تعاقب میں روانہ ہو چکا تھا۔ اس کی نظریں چاروں طرف مجھے تلاش کر رہی تھیں۔ مجھے رکشا میں سوار ہوتا ہوا اس نے دیکھا نہیں۔ پھر ایک عمارت کی اوٹ میں میں نے اپنا رکشا رکوا لیا اور کو دیڑا۔ پھر فتح میدان اسٹیڈیم کی زیر تعمیر عمارت کے مختلف حصوں کے پیچھے خود کو چھپاتا ہوا میں ایک سڑک پر آ گیا۔ میں نے نہیں صرف میری آنکھوں

نے پیچھے پلٹ کر دیکھا، حسین سیٹھ آتو نہیں رہا ہے۔ اور جلدی جلدی، میں نے
نہیں، میرے قدموں نے سڑک ناپ دی اور جب ایک موڑ پر میں نے رک کے
دم لیا تو میں نے دیکھا کہ کوئی بارہ سالہ لڑکا اس سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا مجھے
تک رہا ہے جس سڑک پر سے گزر کر میں زندگی کے اس موڑ تک آ پہنچا تھا۔
میں نے غور سے دیکھا، شاید یہ وہی سڑک ہے جو عالیہ اسکول کے سامنے سے
گزرتی ہے۔ شاید یہ وہی لڑکا ہے جو میری تنہائیوں کا ساتھی ہے اور جس کا
قرض میرے وجود پر ہے۔ شاید آج بھی اس نے میرا راستہ روکنا چاہا تھا لیکن میں
نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے پلکیں جھپکا ئیں حسین سیٹھ مجھے
نظر آیا، لیکن یہ لڑکا برابر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بڑا دلگیر تھا۔ میں نے اسے
پہچان لیا۔ شاید یہ وہی بارہ سالہ لڑکا تھا جو کھیلتے کھیلتے مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔
میرا سب سے بڑا بیٹا، میرا لخت جگر ـــــ وہ مجھے اس طرح حیران کھڑا ہوا دیکھ کر آہستہ
آہستہ میری طرف بڑھا، جب پاس آ گیا تو میں نے دیکھا اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی
تھیں، ہم ایک دوسرے کو بس دیکھتے رہے، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے
ہوں لیکن جانے کیوں میری پلکیں بھی نم ہو گئیں اور اس کا چہرہ اور بھی دھندلا
گیا۔ پھر میں نے ندامت سے گردن جھکا لی ـــــ اُف! میں کس رہ گزر کو پیچھے چھوڑ
چکا تھا۔

— —

مہمان

سوئی نگری گونج اٹھی تھی اور اس نے لاکھ جتن کیے کہ اس گونج کو صرف اپنے ہی من میں اس طرح چھپائے رکھے کہ کوئی بھی کچھ نہ سن پائے۔ لیکن یہ گونج تو چھپائے نہ چھپتی تھی۔ خود اس کے اپنے چہرے پر چاندنی بن کر پھیل گئی تھی، یہ کیسی آواز تھی۔ یہ آواز کا کیا جادو تھا، یہ کیسی ٹھنڈی چاندنی تھی۔ یہ کیسی صبح کی نرم گرم دھوپ تھی جو اس میں سما گئی تھی اور اس کا سارا وجود بس ناچ رہا تھا۔

کوئی آ رہا ہے ــــ کوئی آ رہا ہے ــــ جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔ جس نے اس کا سب کچھ اپنے قبضہ میں کر لیا تھا ــــ کیسی دھاندلی مچا رکھی تھی اس نے کہ وہ نہ آیا، تو ایسی نعمتیں جو اسے حاصل تھیں وہ بھی آہستہ آہستہ

اسے چھوڑنے لگیں۔
شفو کی ماں بھی تو اس کی اپنی ماں کے برابر تھیں، لیکن کس سفاکی سے
کہہ دیا تھا انھوں نے ۔۔۔۔ بیاہ لانے دوکسی اور کو آخر اس کا بھی تو ارمان نکلے
اور وہ سوچنے لگی "میری اپنی امی تو بس منھ تکتی رہ گئی تھیں ان کی ماں کا۔"
کتنے زخم اس نے اپنے ہی ناخنوں سے نوچ کر ہرے کر لیے، کتنے زخم سوکھنے
لگے تو کسی نے کرید دیا۔
پھر وہ زخم تو بس رستا ہی رہتا تھا۔ جو شفو نے لگا یا تھا۔ شفو بھلا نفنڈ
کا ہے کو تھی ان کی۔ شفو کی بھاوج بننے سے قبل تو وہ خود شفو کا دل تھی، گھر میں
ساتھ کھیلنا، محلے میں ساتھ کھیلنا، اسکول میں ساتھ پڑھنا۔ گھروندے ایک ہی
مٹی سے بنتے۔ گڑیاں ایک ہی چوکی پر سجائی جاتیں۔ کتاب کھو جاتی تو کلاس
میں ایک ہی کتاب کے لفظوں کے دو نظریں مل کر گنہ کرتا تیں۔ یہاں تک کہ میں
سٹی کا دیا ہوا ہوم ورک ایک ہی تحریر سے دو علیحدہ نوٹ بکس میں کیا ہوا ہوتا۔
اور اب گھروندے بنانے والوں نے گھر بسا لیے تھے۔ گڑیوں کی شادی
کی خوشیوں نے بڑھ کر اتنے اندھیرے گوشے منور کیے کہ خود اس کی شادی سے گھر
کا چپہ چپہ چمک اٹھا، سلگ اٹھا۔ اور شفو تو بس باؤلی ہو گئی تھی۔ "میں اس کی
نند نہیں ہوں جی۔ تمھاری سالی ہوں" وہ اپنے بھائی کو چھیڑتی "سیب سے
گال کر دو نایاب دیا ہے بھیا تجھے۔ ذرا سا دل میں میل آئے گا تو میں حساب
چکاؤں گی۔ نیند سے جگانا مت بھیا جی۔ سوتی کو اٹھانا مت جناب"
شادی کے گھر کا جو حال تھا۔ وہی حال شفو کے دل کا بھی تھا۔ ایک

ایک کی مدارات کرتی پھرتی۔ آنگن میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ تو شفق کے دل میں لڈّو پھوٹ رہے تھے۔

ایسی شفق نے بھلا جب یہ کہہ دیا کہ میرا جیا تو ایک ایسا طوطا ہے جو بے ثمر کی شاخ پر رام بھروسے بیٹھا پھل پھول کا منتظر ہے۔ نہ خزاں معلوم نہ بہار کا پتہ۔ بس انتظار ہی انتظار ــــ تو اس کے دل پر چوٹ لگی تھی۔

لیکن دن تھے کہ مہینوں اور برسوں میں تبدیل ہو رہے تھے... سورج کو نکلنے اور ڈوبنے سے مطلب ــــ وقت کی ایک لمبی سی لکیر تھی جو پیچھے چھوٹ رہی تھی۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس لکیر کو دیکھا جو ایک ناہموار راستے کی صورت میں اس کے سامنے تھی۔ پھر یہی راستہ ایک چٹیل میدان بن کر اس کے اطراف پھیل گیا۔ وقت کا ایک ایسا چٹیل میدان جس میں نہ کوئی اپنا تھا نہ پرایا۔ بس ایک ہو کا عالم تھا ایک سنّاٹا۔ اور اس سنّاٹے میں اس کا کچھ تھا تو اس کے زخم تھے۔ سوکھے سوکھے بھی، ہرے بھرے بھی۔ اس نے ان زخموں کی فصل کو اپنے آنسوؤں کا پانی دے دے کر سینچا۔

یہ آنسو بھی تو چپ چاپ بہہ بہہ جاتے ہیں۔ رخسار کی شگفتگی، آنکھوں کی جوت، بدن کی تازگی سب اس کھارے پانی سے دھل کر اپنا رنگ روپ کھو دیتے ہیں۔

اس نے بھی اپنا رنگ روپ دھیرے دھیرے کھویا۔

جو اس کا تھا نہیں وہ اسے نہ مل سکا تو وہ بھی اس سے چھوٹنے لگا جو اس کا اپنا تھا۔

شفی کے بھیا نے آخرش گورنمنٹ میں درخواست دے دی کہ انہیں دوسری شادی کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ ان کی موجودہ بیوی کے بطن سے سات سال سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ وہ تو خیر گزری جو سرکاری عہدہ دار ہونے کے ناطے شفی کے بھیا اس حد تک مجبور تھے، ورنہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ ـــ دیر کس بات کی تھی۔ اللہ کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ نہیں تھا تو بس ان کے بعد جائداد کا وارث نہیں تھا۔

شفی نے پوچھا تھا "بھیا دوسری شادی کے لیے حکومت کو درخواست دے رہے ہیں۔ تم بھی رضامندی ظاہر کرکے ان کی مدد کرو گی نا۔"

پلکیں جھپک کر اس نے شفی کو اس طرح دیکھا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر یکایک بوکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ پگلی کہیں کی یہ کبھی نہ سوچا کہ ہنسی تو پھر بھی ہنسی ہے۔ ہونٹوں کی ہو کہ زخموں کی۔

خاندان بھر میں بات اس طرح پھیلی جیسے جلتی آگ پر کسی نے تیل چھڑک دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک مجرم ہے جس کے جرم کے خاندان بھر میں چرچے ہیں۔

لیکن ہمدردی کے دو چار لفظ جب بھی اس کے حصے میں آئے۔ اس نے بھی یہ سمجھا کہ بعض ایسے بھی ہیں جو اسے مجرم نہیں سمجھتے اس کا ندامت سے نگوں سر کبھی کبھی اوپر اٹھا بھی تو بس اس سہارے کہ وہ سبھوں کی نظروں میں مجرم نہیں ہے۔

دکھوں کی اس یورش میں جب کہ آسمان پر چمکنے والے ستارے ٹھنڈک نہیں پہنچاتے، چوٹ لگاتے ہوں۔

غم کدے جیسے اس چمن زار میں جبکہ کلیوں کی چٹک سے زخم ہرے ہوتے ہوں، پُروائی کے چلنے سے روح کا کرب جاگ اٹھتا ہو۔
اس نے ایک آواز سنی اور سونی نگری گونج اٹھی۔

میں آرہا ہوں ـــــ میں آرہا ہوں۔
یہ تخلیق کی راحت تھی جو کسی کی آمد آمد کا پتہ دیتی تھی۔
اس نے اپنے وجود میں ایک ہلکا سا ارتعاش محسوس کیا، اس نے اپنے میں ایک اور زندگی کو کسماتے ہوئے پہچان لیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کا بدن اپنا کھویا ہوا رنگ روپ پھر سے پا چکا ہے اور یہ سب کچھ بس دنوں ہی کی تو بات تھی۔
برسوں کے سناٹے اس کی ہستی کے اس نئے شور سے ٹکرائے اور سونی نگری گونج اٹھی۔ اس نے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھا تو وقت کا چٹیل میدان اب ہری بھری کونپلوں سے جیسے پٹا پڑا تھا۔ ماضی کے کھنڈر میں بھی حال کی گونج سنائی دے رہی تھی۔
اب کیا ہوگا؟ اس کی ساس نے سوچا۔ شفو نے بھی اپنی نئی بھابی تلاش کر لی تھی۔ بات نہ صرف پکی ہو چکی تھی۔ بلکہ کچھ چڑھاوے بھی لے جائے جا چکے تھے۔ بس حکومت سے منظوری حاصل ہونے کی دیر تھی۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ حکومت کی جانب سے اس کا طبی معائنہ بھی کرایا جائے گا۔
لیکن اب تو دیکھتے دیکھتے کسی نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ آرہا ہے اور اس اعلان کی گونج جب اس کے دل میں مقید نہ رہ سکی تو چہرے پر تمازت بن کر پھیل گئی۔

وہ کب یہ چاہتی کہ لوگ اس کے رخساروں پر پھیلی ہوئی شفق کی سرخی سے آنکھیں پھیر لیں۔

وہ کب یہ چاہتی تھی کہ اس کی ساس اکی شفقی شفی کے بھیا اس کی آنکھوں کی وہ جوت دیکھیں ہی نہیں جس جوت نے اس کے سارے کا سارا مستقبل منور کر کے رکھ دیا تھا۔

اپنے ہی من مندر میں اس کو بسائے رکھنے کے اگر اس نے جتن کیے بھی تو صرف اسی لیے کہ خود اس کو کسی کی آمد کا بھرپور یقین ہو جائے — کہیں ایسا نہ ہو — کہیں ایسا نہ ہو کہ — لیکن نہیں — وہ تو آرہا ہے — وہ تو آرہا ہے۔

لیکن اب کیا ہوگا ؟ اس کی ساس نے سوچا۔

شفقی نے بھی اپنی نئی بھابی تلاش کر لی تھی۔

لیکن جب شفقی کو یقین ہو گیا تو اس نے اپنے ننھے کے گال پر چٹکی بھر کے کہا "لو جی! تمہارے لیے ماموں اب ایک گڑا لا رہی ہے — اوں آں اوں" اور شفقی نے اپنی بھابی کے پیٹ کو گدگدا کر اس کو خوب خوب ہنسایا۔

کھل کر ہنسنا کتنی بڑی نعمت ہے۔ آج اس نے محسوس کیا۔ دکھوں کا قبرستان اب تو سربند کلیوں کا چمن زار بن گیا تھا۔

شفقی کے دل میں بھی سوئی ہوئی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔ اپنی بھابی پر اس کو اتنا بہت سا پیار آیا۔ پیار جو محبت سے زیادہ جذبۂ رحم کا نمائندہ تھا۔

بھیّا دفتر سے لوٹے تو شفی ان کی گردن میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔
"لاؤ جی کرو منھ میٹھا اور کل ہی اپنی درخواست حکومت سے واپس لے لو۔"
بھیّا کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
وہ بھی تو انھیں پسند آ گئی تھی۔ جس سے وہ اپنی زندگی کا ناطہ استوار کرنے والے تھے۔
"کیا لڈّو منھ میں رکھ لیا ہے؟" شفی نے بھیّا کو پھر چھیڑا تو وہ چونکے۔
"امّی نے کیا کہا؟" وہ کچھ اس طرح بولے جیسے خود کچھ کہنا چاہتے ہوں۔
"اب کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے" شفی نے جھٹ سے جواب دیا۔
خاندان بھر میں یہ بات بھی گلستاں میں بھری بہار کی تازگی کی طرح پھیل گئی۔
کتنی ہی آنکھیں اس کی ہمدردی میں نم ہو گئیں۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ سانچے بادشاہ تیری دین نرالی ہے۔
شفی کے بھیّا حکومت کے ذمہّ دار عہدیدار جو تھے۔ انھوں نے اپنی درخواست واپس لے لی۔
اس کی ماں نے کہا "یوسف شریف بابا کی درگاہ پر میں نے بھی عرضی اسی روز چڑھا دی تھی، بیٹا جس روز تیرے میاں نے حکومت میں درخواست دی تھی ـــــ"
نیاز نذرانہ میں اس کی ماں نے دو ہزار صرف کیا، فقیروں نے کھانا کھایا،

بے کسوں نے کپڑے پہنے۔

اب تو اس کے اطراف ساری فضا چمک اٹھی تھی۔ چاند نکلے کہ نہ نکلے بس سدا چاندنی ہی چاندنی اطراف میں بکھر گئی تھی۔

کھوئی ہوئی جوانی الٹے پاؤں آکر جیسے اس کے قدموں پر لوٹ گئی۔ اور اس نے اٹھا کر اس کھوئی ہوئی جوانی کو گلے لگا لیا۔

کچھ دن تو یوں گزرے کہ ہر کھانے کی نعمت سے اس کی طبیعت اوب گئی۔ اس کے باوجود جانے وہ کون تھا جو دنیا بھر کی صحت و شگفتگی اس کے حصے میں لے آیا ہو۔

میں آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں۔

اس آنے والے نئے مہمان کی پذیرائی کے لیے اس نے اپنا بہت کچھ تج دیا تھا۔ بس دن رات اسی کے خیالوں میں مگن رہنے لگی۔

موزوں کے رنگوں کا امتزاج کچھ دل کو بھایا یا نہیں، جھٹ سے سوئیٹر بننا شروع کر دیا۔ لال اون کو سفید اور کالے اون سے جوڑ جوڑ کر دیکھا۔ سوئٹر تیار ہو گیا تو پھر اسی رنگ کے موزے بھی بُنے جانے لگے۔ کنٹوپ تیار ہوا۔ پھر جرسی بنی۔ پھر پھندنے والی ٹوپیاں۔

مشین پر چھوٹے بڑے بابا سوٹ سیے گئے۔ فراکیں سلیں شیفی نے آکر گدگدایا اور چھیڑا تو مشین پر دوڑتے ہوئے کپڑے سے نظریں اٹھیں، مسکرائیں، شرما کر جھکیں، پھر اپنے ہی تصورات میں گم ہو گئیں۔

شفی کے بھیا کو بھی اس کی دیوانگی پر ایک دن پیار آگیا۔ جب کہ وہ

ڈھیر سارے کھلونے خرید کر گھر لوٹی تھی۔ کار کا دروازہ کھول کر جب انھوں نے سیٹ پر دیکھا تو جھنجھنے بھی تھے۔ ناچنے والا بھالو بھی۔ دوڑنے والا موٹر بھی۔ گول چکر لگانے والی ٹرین بھی، گولے بھی، بینڈ بھی اور الّم غلّم کیا کچھ نہ تھا۔

ایک کمرے کو منتخب کر کے اس نے ایک چھوٹی سی دنیا ہی سجا دی۔ ایک کونے میں خوبصورت سا گوڈریج کا پالنا بھی، پلنگ بھی، ایک گوشے میں آئینہ لگی الماری۔ بیچوں بیچ چھوٹی سی میز چھوٹی سی کرسیاں۔

کبھی تو وہ دن دن بھر اسی کمرے کی تزئین و آرائش میں لگی رہتی۔ کبھی اپنے ہی خیالوں میں مگن وہیں فرش پر پڑی پڑی سو جاتی، کوئی خواب میں آکر اسے گدگدا جاتا۔

اس کو اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر اتنا پیار آتا کہ اس کا جی چاہتا کہ جلدی سے اس ننھی سی جان کو جو اس کی ہستی میں سما گئی ہے جو اس کے پیٹ میں کبھی کبھی علانیہ حرکت کرتی ہوئی ہے باہر نکال کر سینے سے چمٹا لے اور خوب خوب چومے۔

پھر ایک رات اس نے تخلیق کا کرب محسوس کیا ... پھر یہ درد اتنا بڑھا کہ اس کی شدّت سے وہ نڈھال ہو گئی۔

ہاسپٹل میں جب اس کی آنکھ کھلی اور اسے ہوش آیا تو اس کے کانوں میں وہی آواز گونج گئی جو نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے لمحے بھر کو چونکا گئی تھی۔

اس کا پھولا پھولا پیٹ اب پیٹھ سے آلگا تھا — میرا مہمان کہاں ہے؟ اس کے دل نے خود اسی سے پوچھا — اس نے اپنے پاس دونوں جانب

دیکھا۔ وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔

"وہ کہاں ہے۔ کہاں ہے میرا بچّہ؟"

اس کی آنکھوں کے آگے اجالے اور اندھیرے گڈمڈ ہو گئے۔ بڑی دقّت سے اس نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو جنبش دی۔ شفی کے بھیّا اس کے پاس کھڑے تھے۔ پلکیں جھپکا کر اس نے پہچاننے کی کوشش کی۔ دھندلا دھندلا چہرہ واضح ہوتا گیا۔ نظریں ملیں اور شفی کے بھیّا نے منھ پھیر کر آنسو خشک کر لیے اور تیزی سے کمرے کے باہر نکل گئے۔

شفی جو ان کے پیچھے کھڑی تھی، آگے بڑھی۔

اس نے بیتاب ہو کر شفی کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔

"وہ کہاں ہے — کہاں ہے میرا بھائی — میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ میں نے صرف آواز ہی تو سنی ہے۔ میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔ شفی مجھے بتا دو۔"

لیڈی ڈاکٹر نے شفی کو اس سے الگ کر دیا تو اس نے لیڈی ڈاکٹر کا ہاتھ پوری قوّت سے دبا کر کچھ پوچھنا ہی چاہا۔ لیکن اس کی آنکھیں مندنے لگیں پھر اس پر غشی طاری ہو گئی۔

کچھ دن بعد جب اسے گھر لایا گیا تو وہ لوگوں میں گھری ہوئی بس سب کا منھ تکے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں دور دور تک آنسوؤں کا کہیں پتہ نہ تھا ایک وحشت سی مزدور تھی۔ جیسے یہ آنکھیں کسی کو تلاش کر کے مایوس اور خوف زدہ ہو گئی ہوں۔

رات کو جب شفی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو بستر خالی تھا۔ وہ بھاگی بھاگی سیدھے اس کمرے میں گئی جو بچے کے لیے سجایا گیا تھا۔ روشنی جل رہی تھی اور کھلونوں اور سامان کو جھک جھک کر قرینے سے رکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بڑا مطمئن تھا۔ اس کی آنکھیں پرسکون۔

شفی نے کواڑ کے اوٹ میں ہو کر اس کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتی۔ کمرے میں ایک ایک شے کو صاف کرتی پھر رہی تھی۔

آخرش شفی کمرے میں دبے پاؤں داخل ہو گئی۔ تب بھی اس نے نہیں دیکھا۔

شفی نے کھانس کر اس کو مخاطب کیا تو وہ پلٹ کر ہمیشہ کی طرح مسکرانے لگی۔

شفی نے دیکھا اس کا پیٹ بہت پھولا ہوا ہے، جیسے نواں مہینہ ہو۔ اس نے گدگدانے کے انداز سے چھو کر دیکھا تو ساری کے اندر کپڑے ٹھنسے ہوئے تھے۔

شفی نے جب گدگدایا تو وہ ہمیشہ کی طرح شرما کر ہنسنے لگی۔ لیکن شفی کی چیخ نکل گئی۔

اور پھر وہ پچھلے پاؤں بھاگتی ہوئی اپنے کمرے تک بھی نہ پہنچی تھی کہ سجولوں نے اسے گھیر لیا۔

اس کے ہاتھ پاؤں سرد تھے ـــ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ بھابی۔

بھابی۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی تو انگلی اٹھا کر اس کمرے کی طرف اشارہ کیا
جو آنے والے مہمان کے لیے سجایا گیا تھا اور جس کی روشنی کھڑکیوں سے باہر
نکل کر گھر کے صحن میں پھیل رہی تھی۔

خالی پٹاریوں کا مداری

اگر وہ مجھے پیچھے سے پکار لیتا — ابّا

تو بھی کیا میں پل بھر کو اس کے لیے ٹھہر سکتا تھا؟

"آنسو مٹی میں گرے کہ دامن میں جذب ہو۔ پلکوں سے چھوٹنے کے بعد نہ کنکر ہے نہ موتی۔"

کیسی کیسی راتیں تج کر عمر کی کشتی میں ڈھلتے ہم کتنی مسافتیں طے کر لیتے ہیں۔ نہ پلٹ کر دیکھنے کی فرصت ہے نہ یاد ہی کر لینے کا یارا۔

آج کوئی دامن پکڑ کر پوچھتا بھی تو نہیں جو شرم سے گردن جھک جائے۔ اور کتنے ٹھسے سے میں گردن اٹھا کر چلتا ہوں۔ سرافراز، سربلند۔ لیکن سچ پوچھو تو ہم کہاں کہاں جا کر اس بیسوا زندگی سے مصالحت کر لیتے ہیں۔

راحت کی عمر ہو گی چودہ برس۔ بالی سی عمر، گڑیاں کھیلنے کے دن۔ کچھ سوچے بغیر نیند کی آغوش میں اپنا آپا تج دینے کی راحتیں اور یہ لڑکی تجھے عمر کی اس منزل پر ملی جہاں ابھی ابھی میری مسیں بھیگی تھیں اور اس کے لیے درخت پر چڑھ کر پکے شہتوتوں سے اس کا دامن بھر دینا میرے لیے فخر کی بات ہوتا۔ اللہ یہ کچی پکی املیاں۔ راحت کا جی میرے ہوتے بھلا یوں ترس سکتا تھا۔

پتھر اٹھا کر درخت پر دے مارا اور لدی املیاں میں نے اس کے قدموں میں بکھیر دیں۔

اور ہم نے کتنی ہی کچر کچر چبا کر تھوک ڈالیں۔

برسات سے جل تھل ہوتے ہوئے میدان میں ایک دوسرے کو چھونے اور پکڑنے کے لیے بھاگنا اور پھر ایک دوسرے کی دسترس سے بچنے کے لیے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر جانا۔ پانی کے چھینٹے اڑا کر کھیلنا اور پھر غور غور سے ایک دوسرے کے گیلے کپڑوں میں سے جھلکتے ہوئے بدن کو جھانکنا۔

پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی لمبی لمبی گھنی سیاہ اور بھیگی زلفوں کو اپنے ہاتھ پر لپیٹ لینا۔

وہ گر رہی تھی اور جب میں نے اس کو پہلی بار سنبھالا تھا تو جسم کے کتنے ہی خطوط، کتنے ہی زاویے، کتنی ہی قوسیں میری آنکھوں میں بس کر رہ گئی تھیں۔ سنبھلنے کے لیے مجھ سے چمٹی ہوئی جب وہ کنارے تک پہنچی تو گویا وہ بھی بہت دور نکل آئی تھی۔ میں بھی بہت دور اسے لے آیا تھا اور اب میں اسے راحت

کے بجائے رات پکارنے لگا تھا۔

اب میں اس کی گڑیوں کے گھروندوں تک جا پہنچا تھا۔ اس کی ان پٹاریوں تک جا پہنچا تھا جن میں جانے کیا الم غلم وہ سوسو جتن سے چھپائے رکھتی تھی۔

پھر جیسے سب کو چھوڑ کر اس نے گھروندوں میں .... مجھے بسا لیا۔

ان پٹاریوں میں مجھے چھپا لیا۔

کرکٹ کا بلا گھما کر جب میں نے گیند پر بہت زور سے ہٹ لگائی تو یہ گیند مٹی کے اس گھروندے کو توڑ کر نکل گئی جو راحت نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔

لیکن اس نے کوئی پرواہ نہیں کی، نہ ہی میرا دل دکھا۔

میں ڈر کر اس کے قریب گیا۔ گیند کو میں نے پرے پھینک دیا تو ہم دونوں مل کر دوسرا گھروندا بنانے میں منہمک ہو گئے۔

گھروندے بناتے، مجھے ان میں بساتے، پٹاریوں میں پہلے میرے تحفے پھر جیسے خود مجھے چھپاتے، میری چوکھی گیند کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہوتے، جب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر گئی تو میں نے گرا گرا کر سنبھالتے ہوئے کنارے پر لا کر اس سے پوچھا ایک بالکل نیا کھیل کھیلو گی؟

اور وہ شرما گئی۔

پھر میں نے زیادہ چاؤ سے شہتوت اس کے دامن میں بکھیر دیے۔

کچی کچی املیوں کی بونگیں اس کے ہاتھ میں ٹھونسیں تو اس نے زیادہ مزے لے لے کر کھا ڈالیں۔ ہم نے یہ نیا کھیل جاری رکھا۔ اس کی آنکھوں کے راستے

میں اس کے دل میں اترتا گیا۔ پھر اس کے بدن ہی کا ایک حصّہ ہو کر رہ گیا کہتے ہیں حوّا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔

اپنی چھوٹی سی عمر کی مختصر سی پونجی لے کر وہ جتنی تیزی سے میری زندگی میں داخل ہوئی اتنی ہی تیزی سے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر کے مجھ سے جدا بھی ہو گئی۔

جب وہ اپنا سب کچھ مجھ پر لٹا رہی تھی، اُس وقت نہ ہی میں نے جنم جنم کے لیے اس کا ہو رہنے کی قسمیں کھائیں، نہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کو یقین دلایا کہ اب اسی طرح اس کے قدم بہ قدم زندگی کا سفر پورا کر لوں گا۔

ہمارے بنگلے کے پیچھے ایک عالی شان محل تھا جس کے احاطے میں ایک خوبصورت سا چمن تھا جو اپنی رعنائی آہستہ آہستہ کھو رہا تھا، اس محل کے ایک حصّے میں راحت اور اس کی ماں رہتے تھے۔ بنگلے کا تین چوتھائی حصّہ مقفّل تھا۔ احاطے کے باغ میں جو بیرونی کمرے بنے ہوئے تھے اُن میں ایک مالی ایک مالن اور اس کے بچے رہتے تھے۔ چمن کی دیکھ بھال اور راحت اور اس کی ماں کے احکام کی تعمیل ان کے ذمّہ تھی۔ اس کی ماں اسی بڑے گھرانے کی پروردہ تھی۔ گھر کی بیگم صاحبہ کو خوش کرنا۔ اپنی الٹی سیدھی باتوں سے ان کا دل بہلانا۔ اداس ہوں تو ہنسانا۔ ہنس رہی ہوں تو قہقہے لگوانا۔ قہقہے لگائے جائیں تو عمر بھر خوش رہنے کی دعائیں مانگنا۔ بس یہی کبھی اس کے فرائض تھے لیکن اب وہ بیگم صاحبہ رہ گئی تھیں، نہ ان کو ہنسانے کے جتن کرنے والے۔ راحت کی ماں بھی اپنی دی ہوئی دعاؤں میں تاثیر ڈھونڈتی رہ گئی اور آہستہ آہستہ جاگیریں ضبط ہو گئیں۔

راحت کی ماں نے بھی اچھّے دن دیکھے تھے۔ ان کے میاں صاحب کے مصاحب

تھے اور یہ تھیں بیگم صاحبہ کی سخوچڑھی ۔ راحت کے ابا کو اللہ کو پیارے ہوئے کوئی تین سال ہو گئے تھے۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کے وہ دن نذر ہے تھے کہ انھیں خوش رہنے کی دعائیں دی جاسکیں۔

راحت کی ماں کو ماہ بہ ماہ پنشن برابر ملتی تھی۔ جاگیروں کی ضبطی کے بعد حکومت نے ان وظائف کو یک لخت مسدود نہیں کیا تھا جو پہلے ہی سے منظور تھے سو انھیں ماہ بہ ماہ پنشن مل جاتی ۔ اس کے علاوہ ضلع بھر میں راحت ہیر آئیل بہت مرغوب ہو گیا تھا۔ راحت کی ماں نے اپنی لاڈلی ہی کے نام سے جب یہ چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تو اسے کافی منافع ہوا اور واقعی ضلع بھر میں راحت ہیر آئل گھر گھر میں تھا۔ ہمارے گھر نہ صرف امی وہی لگاتی تھیں بلکہ تحفے کے طور پر ہمارے چند رشتہ داروں کو جب انھوں نے شیشیاں شہر بھجوائیں تو پھر ہر ماہ بھجوانے کا انتظام بھی انھیں کرنا پڑا۔

راحت کی ماں کہتی تھیں کہ شیشیوں کے لیبل پر جس لڑکی کی تصویر ہے، وہ راحت ہی کی ہے۔

یہ دعویٰ نہ کبھی میری سمجھ میں آیا، نہ ہی میں نے کبھی اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ہیر آئل کی تصویر میں اگر کوئی چیز راحت سے مشابہہ تھی تو بس لمبی لمبی زلفیں تھیں - چہرہ تو بالکل جدا تھا۔ اچھی خاصی بھرپور عورت کا۔ لیکن مجھے ان تصویروں سے بھلا لینا دینا ہی کیا تھا۔ میں تو راحت کی ان لمبی لمبی گھنی زلفوں میں منہ چھپا کر جو راحت ہیر آئل سے معطر رہتیں، اس سے کہا کرتا۔

" تم خدا کے لیے یہ تیل مت لگایا کرو راحت ۔ تمھاری زلفوں میں جب

منھ چھپاتا ہوں تو تمھارا یہ تیل میرے گالوں پر، میرے سارے چہرے پر لگ جاتا ہے۔ سوچو تو بھلا اگر میرے چہرے پر یہ لمبے لمبے بال اگ آئیں ۔۔۔ پھر تو تم ہی ڈر کر میرے قریب نہیں آؤ گی۔ تب میں کیسا اکیلا اکیلا پھروں گا۔ بن رات کا چندا کہیں بھایا ہے۔" اور اس کی زلفوں میں منھ چھپا کر میں دیکھ، بن بن کر اسے ڈراتا۔ گدگداتا اور وہ اپنے لمبے لمبے بالوں سے میرے ہاتھ ملا کر انھیں زنجیر کر دیتی۔

کیسے کیسے کھیل اس مختصر مدت میں ہم نے رچا ڈالے۔ اپنا دامن پھیلائے وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی اور میں نے بغیچے کے سب ہی شاداب اور رنگین پھول توڑ ڈالے اور اس کا دامن بھر دیا۔ ان پھولوں کا اس نے جب ہار بنا کر مجھے پہنانا چاہا تو میں نے جھپٹ کر اس سے ہار چھین لیا اور اس کی لمبی سیاہ راتوں جیسی زلفوں میں گوندھ کر جیسے ~~ملفوں میں گو~~ ستارے ٹانک دیئے۔

پھر انہی سیاہ راتوں میں چھپ چھپ کر انھیں ستاروں کی چھاؤں میں میں کتنی ہی بار اس کا ہو ہو گیا اور وہ میری۔ ایک دن اس نے سر جھکا کر مجھ سے کہا۔

"مجھے ابکائیاں سی آتی ہیں۔ میرا جی او بنا رہتا ہے۔ مجھے وہ کچی املیاں توڑ دو نا۔" اس سے پہلے کہ میں پتھر لے کر لدے ہوئے املی کے درخت پر دے مارتا۔ میں نے راحت کا کرتا اٹھا کر اس کے پیٹ کو سہلایا۔ پھر جھک کر چٹا چٹ پیٹ کو چومنے لگا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا "یہ کیا کرتے ہو"
میں نے خوشی خوشی اس کی آنکھوں میں اترتے ہوئے کہا "اس میں میرا بچہ ہے پگلی"
اس کی آنکھیں پل بھر کو جگنوؤں کی طرح چمک اٹھیں۔ پھر صرف اس کی زلفوں کی سیاہ رات رہ گئی اور آنکھوں کے جگنو جانے کہاں جا بسے۔
میں اکیلی خوش ہی تھا کہ وہ اس قدر اداس ہو گئی۔
میرے سینے پر سر رکھ کر جب وہ سسکنے لگی تو سسکتے سسکتے اس نے پوچھا "اب کیا ہو گا؟"
اور میں سوچنے لگا واقعی اب کیا ہو گا۔ میں تو اس قدر خوش ہو رہا تھا۔ راحت کی آنکھوں میں بھی جگنو چمک اٹھے تھے۔ لیکن شاید یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہی نہ تھی۔
میں نے اس کو دلاسا دیا۔ جھوٹ موٹ تسلیاں دیں۔ بہلایا منایا اور جب وہ کچھ مسکرا سکی تو اس کو گدگدا کر ہنسایا اور اپنی محبتیں جھوم جھوم کر اس پر نچھاور کیں۔
میں سمجھ گیا تھا کہ میں اور راحت اب کچھ اور دنوں تک ایک دوسرے کے نشے میں چور نہ رہ سکیں گے۔ اب نہ میں اس کا دامن شہتوت سے بھر سکوں گا نہ چمن کے شاداب پھولوں سے اب نہ ڈھیر سی املیاں اس کے حکم پر مجھے توڑ لانا ہے نہ وہ اب میری باہوں میں جھومتی ہوئی انھیں کچر کچر چبا کر تھوکتی رہے گی۔

گزرے

پانی برسا کرے گا۔ میدان بھی جل تھل ہوں گے۔ سوکھے گڑھے پھر سے بھر جائیں گے۔ ہریالی دور دور تک مخمل کی طرح بچھی رہے گی۔ تتلیاں بہکیں گی۔ خالی جھولا اس گھنے نیم کے پیڑ پر ہوا سے ہلکورے کھاتا رہ جائے گا — مینڈک سرِشام ٹر ٹر کرنے لگیں گے۔ میں اکیلا گھر سے نکلوں گا تو راحت قدم قدم پر راستہ روکے گی۔ ہنستی دوڑتی اچھلتی بھاگتی مجھ سے چمٹی میری باہوں میں جھولتی۔ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنی زلفوں سے زنجیر کرتی، قہقہے لگاتی۔ پھر وہ ایک دم ٹھٹک کر رہ جائے گی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جگنو دم بھر کو جھلملیں گے۔ پھر وہ گردن جھکا کر اداس ہو جائے گی، پھر وہ سسکنے لگے گی۔ میں اپنے تصورات کی دنیا میں اس کو کب تک اٹھائے اٹھائے پھروں گا ایک دن، دو دن پھر میں بھی شہر چلا جاؤں گا۔

دو دن گزر گئے۔ راحت نہیں آئی۔ جب میں سرِشام اپنے مخصوص راستوں سے ہو کر اس کے گھر پہنچا تو اس کے باغیچے کے پھول رو رہے تھے۔ کانٹے ہنس رہے تھے۔ عمارت کے اس حصے میں جہاں وہ رہتی تھی، مالن دیا جلا کر رکھ رہی تھی۔ مالی نے مجھے بتایا راحت بی بی بہت بیمار ہو گئی تھی۔ اس کی ماں بہت پریشان تھی اس کو علاج کے لیے شہر لے گئے ہیں۔

میں لوٹنے لگا تو راحت جیسے کرتہ اٹھائے اپنا ننگا پیٹ میرے سامنے لیے کھڑی تھی۔

" اس کو چومو اس میں تمہارا بچہ ہے "

راحت کی ماں امّی کی بڑی چہیتی تھی، اس کی خوش طبعی، اس کے

آداب و تمیز، اس کے رکھ رکھاؤ کی امّی دلدادہ تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے امّی سے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہوگا۔ میں نے کرید کرید کر امّی سے پوچھنا چاہا لیکن انھیں تو اس کا بھی علم نہ تھا کہ راحت اور اس کی ماں شہر چلے گئے ہیں۔ بمشکل آٹھ دن گزرے ہوں گے کہ راحت کی شادی کے دعوت نامے ہمیں ملے۔ امّی نے ٹیلی گرام کے ذریعہ راحت کی امی کو مبارکباد دی اور انھیں نیک تمنّائیں بھیجیں۔

میں چپکے سے اس کے باغیچے میں پہونچ کر بہت سا وقت وہاں گزار آیا۔

کالج کھل گئے تو میں بھی داخلہ لینے کے لیے شہر چلا گیا کیونکہ ہائی اسکول میں پاس کر چکا تھا۔

کچھ ہی دن بعد ابّا کا تبادلہ اس ضلع سے ہو گیا اور اس طرح راحت سے ملنے اسے دیکھنے، اس سے صرف ایک بار بات کر لینے کی تمنا بھی پوری نہ ہو سکی اور اس سے پہلے کہ یہ تمنا حسرت بن کر دل میں جا گزیں ہو جاتی، اپنی موت آپ مر گئی اور وہ اس طرح کہ مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا۔

میں "راحت" کو بھول بھال گیا۔ عمر کی اس منزل میں جبکہ کالی راتیں جگمگاتے دنوں سے زیادہ پیاری ہوتی تھیں میں راحت کی سیاہ زلفوں میں اپنے ہاتھوں کو کب تک زنجیر رکھ سکتا تھا۔ کالج کے دن رات، ہماہمی، چہل پہل گہما گہمی۔

ہاں ایک ننھی سی یاد تھی جو دل کے کسی تاریک گوشے میں چھپ کر سہمی سمٹی بیٹھ گئی تھی۔ لرزاں لرزاں، ہراساں ہراساں۔ سپیرے کی پٹاری میں

چھپی ایسی ناگن کی مانند جس کا زہر چھین لیا گیا ہو۔ پھن کھول کر سر نکال لیناتو آئے، پر ڈس کر تڑپا نا بس میں نہیں۔

اور یہ بے ضرر ناگن کبھی کبھی اپنا پھن پٹاری سے باہر اس وقت نکال لیتی ہے جب میرے خاندان میں کسی کو پہلوٹھی کا بچہ ہوتا ہے ــ اور پھر خود ہی اپنا سر اندر کر کے چھپ رہتی ہے اور وقت اس پٹاری کا منھ پل بھر میں ڈھنک دیتا۔ راحت تجھے اس وقت بھی یاد نہیں آئی۔ جب میں نے اپنی دلھن کا گھونگھٹ اٹھایا۔ میں تو پلکیں جھپکا کر چودھویں کی اس چاندنی کا ہو رہا تھا جو میرے اطراف پھیل گئی تھی۔

ایک دن جب میری بیوی نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر نیچی نیچی نظروں سے مجھے بتایا کہ جی اچھا نہیں ہے۔ وہ مضمحل مضمحل سی ہے ــ اُسے ابکائیاں سی آتی ہیں۔ تو جھٹ کسی لڑکی نے کرتا پیٹ پر سے اٹھا کر مجھ سے کہا " اُسے چومو اس میں تمھارا بچہ ہے "

مجھے راحت سے جدا ہونے کے بعد پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ مداری کی پٹاری میں چھپی ہوئی بے ضرر ناگن کچھ اس طرح لہرا کر میرے سامنے آئی ہے کہ مجھے ڈس لے گی۔ پتہ نہیں کس نے اس کو اس کا زہر لوٹا دیا تھا۔

میں نے اپنی بیوی کے گال چوم لیے۔ اس کا پیٹ نہ چوم سکا۔

تب میں نے اس ناگن کا سر کچل دینا چاہا۔ لیکن وہ بہت تیزی سے اپنی پٹاری میں جا چھپی۔ جب میں نے پہلی بار اپنے ننھے کو چوما تو اس ناگن نے لہرا کر پھر ایک بار سر نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے پٹاری کا منھ مضبوطی

سے بند کر دیا۔

پھر آہستہ آہستہ یہ ناگن مر گئی اور میں بھول گیا کہ کوئی خالی پٹاری میں نے اپنے دل میں چھپا رکھی ہے۔

آج بھرے میلے میں جب میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گھوم رہا تھا تو کسی عورت نے مجھے سلام کیا۔ کچھ ہی دور پر وہ کسی دوکان پر کھڑی اپنے بچوں کو کھلونے دلا رہی تھی۔ میری بیوی کسی سہیلی سے جو اسے ابھی ابھی ملی تھی بڑی پیاری پیاری باتیں کرنے میں مگن تھی۔ آیا میرے بچوں کو پاس ہی کی ایک دکان سے کھلونے دلا رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے پھر اس عورت کی طرف دیکھا جو مجھی کو دیکھ رہی تھی۔

کسی اضطراب کا اظہار کیے بغیر خراماں خراماں جب میں اس کے قریب پہنچا تو کوئی مانوس سا چہرہ اپنی چھب دکھلا کر سامنے آتے آتے چھپ گیا۔ پھر کسی لڑکی نے اپنا دامن پھیلا کر آہستہ سے کہا اسے پکے پکے شہتوتوں سے بھر دو اور جب میں نے دامن بھر دیا تو اس نے سارے شہتوت میرے قدموں میں ڈال دیے اور اپنی سیاہ لمبی رات جیسی زلفوں سے میرے دونوں ہاتھ ملا کر زنجیر کر لیے" اوہ۔ ا راحت"

وہ میرے پہچان لینے سے خوش ہو گئی۔

" لیکن رات تمھاری زلفیں ـــ" بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

اس نے دھیرج سے کہا " بے چاند کے کالی رات بھیانک لگتی تھی مجھے"

وہ راحت ہیرابیل کے لیبل کی اس بھرپور عورت سے بہ ۔۔ مشابہ ہو گئی تھی جس کو کبھی اس کی ماں راحت ہی کی تصویر کہا کرتی تھی اور آج اسی کی۔ وہی

سیاہ زلفیں نہ رہی تھیں جو اس تصویر سے کبھی اس کی وجہ مشابہت تھیں۔

میں نے حال احوال پوچھا۔

اس نے کوئی شکایت نہیں کی۔

پاس کھڑے ہوئے سات آٹھ سالہ بچّہ کی بانہہ پکڑ کر میرے مقابل کرتے ہوئے پوچھا: "اس کو پہچانتے ہیں آپ؟"

البم میں محفوظ اپنے بچپن کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی جسے دیکھ کر میری بیوی نے کہا تھا اس وقت بھی آپ اتنے ہی شریر رہے ہوں گے جتنے آج ہیں۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بس اس کو دیکھتا رہ گیا۔ راحت نے پھر پوچھا۔

"نہیں پہچانا آپ نے؟"

میں نے کہا "تو میں ہوں راحت!"

تو اس نے نظریں جھکا لیں اور بچے کو جھکا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "انھیں سلام کرو۔ ننھا سا سر خم ہوا۔ ننھا سا ہاتھ پیشانی تک اٹھا۔

اور میں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

میری بیوی اپنی سہیلی سے رخصت ہو کر میرے پاس آگئی تھی۔ میں نے راحت کا تعارف اس سے کرایا "ابا کے زمانہ ملازمت میں یہ اور ہم ایک ہی ضلعے پر تھے۔ امّی میں اور ان کی والدہ میں بڑا بہنا پا تھا۔"

دونوں جانب سے ہاتھ اٹھے۔

میری نظریں خود ہی اس ننھے پر اٹھتی رہیں۔

میری بیوی نے بھی جب اس کو دیکھا تو اس کی نظریں اس کے چہرے پر جم کر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اس نے بڑی مخصوص نظروں سے مجھ کو دیکھا۔ پھر بچے کو دیکھ کر قریب کرتے ہوئے کہنے لگی "کتنا پیارا سا ہے"

میں نے اس کی باتوں سے بوکھلاتے ہوئے کہا "چلو چلیں اب"۔

جب ہم جدا ہونے لگے تو میں نے راحت پر بس اٹھتی ہوئی نگاہ ڈال لی۔ اس سے نظریں چار نہ کر سکا اور نہ بچے ہی کو دیکھا۔

جب ہم آگے بڑھ گئے تو میں نے کسی نہ کسی بہانے پلٹ کر بچے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے نظر نہ آیا۔ اور ایسے میں اگر وہ مجھے پیچھے سے پکار لیتا "ابا" تو کیا میں پل بھر کو اس کے لیے ٹھہر سکتا تھا؟

راحت کی آنکھیں لیکن میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔

میری بیوی نے کہا "وہ بچہ واقعی کتنا پیارا ہے۔ آپ کے بچپن کی وہ شریر سی تصویر ہے نا۔ ہو بہو اسی طرح۔"

"اچھا؟" — میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں نے غور نہیں کیا۔ تم نے وہیں بتایا ہوتا۔"

وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی "بھلا ایسی بات میں وہاں کیسے کہہ سکتی تھی —"

مجھے یوں لگا جیسے میری بیوی میرے دل میں چھپی ہوئی بند پٹاری کھول رہی ہے اور میں جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام رہا ہوں کہ اس میں ناگن ہے ڈس لے گی۔

لیکن پٹاری کھلی تو خالی تھی۔

اس میلے میں، اس چہل پہل میں، اس گہما گہمی میں کوئی بھی تو نہیں تھا جو میری خاموش پکار سنتا کہ میں خالی پٹاریوں کا مداری ہوں۔ کوئی ہے جو میرا تماشا دیکھے۔

ہم سفر

طوفانی بارش تھی اور فرسٹ کلاس کے کمپارٹ منٹ میں وہ اکیلی تھی۔

رات اس کی زلفوں سے زیادہ تاریک تھی لیکن کمپارٹ منٹ میں جو روشنی تھی وہ اس کی ہنسی کے سامنے ماند پڑ رہی تھی۔

آرٹ کی بین الاقوامی نمائش شروع ہو چکی تھی اور میں دلّی جا رہا تھا۔ بارش سے شرابور جب میں کمپارٹ منٹ میں داخل ہوا تو سوٹ کیس رکھنے سے قبل ہی مجھے ایک نسوانی آواز نے چونکا دیا۔

"آپ تو سارا طوفان اندر لے آئے ہیں" یعنی اس نے کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد لمحہ بھر بھی مجھے سنبھلنے کی مہلت نہیں دی۔ لیکن اس

کی طرف دیکھے بغیر اپنی موجودہ حالت درست کرنے میں مجھے عافیت نظر آئی۔
میں صرف اتنا جانتا تھا کمپارٹمنٹ میں وہ اکیلی تھی۔

واقعی پانی بڑی تیزی سے میرے واٹر پروف پر سے پھسل کر کمپارٹمنٹ کے فرش پر پھیل رہا تھا۔ میں نے واٹر پروف اتار کر دروازے کے قریب لگی ہوئی کھونٹی سے ٹانگ دیا اور کنکھیوں سے اس کو دیکھا۔

وہ تو میری طرف ہی دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

میں نے بال درست کیے۔ جھک کر سوٹ کیس سے تولیہ نکالنا چاہا تو سوٹ کیس غائب تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ درآں حالیکہ اس طرح تلاش کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے تو بس آتے ہی سوٹ کیس یہیں دروازے کے قریب رکھ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ٹرین کے ساتھ جو پولیس کا فنٹیل ہے اس کو مطلع کر دوں، لیکن سیٹی ہو چکی تھی اور ٹرین نے طوفانی بارش اور جھکڑوں میں آہستہ آہستہ شروع کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اپنے لانبے بال جھٹک کر خشک کرنے چاہے۔

اس نے تولیہ میری جانب بڑھا دیا۔ "لیجئے"

میں نے شکریہ ادا کرکے تولیہ لے لیا اور بال خشک کرتا ہوا اس کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ تو اس طوفانی سیاہ رات میں مدھم مدھم سا اجالا تھی۔ غضب کا ملیح چہرہ، بہت ہی تیکھے نقوش۔

لیکن اس کی یہ بے تکلفی مجھے کچھ گوارہ نہ ہوئی۔ مجھے کچھ ایسا محسوس

ہوا جیسے اس کی حسین شخصیت اپنی کشش کھو رہی ہو۔ بعض وقت خوبصورتی بغیر کسی پندار کے کتنی چھوٹی لگتی ہے۔

میں نے سر خشک کر کے تولیہ اس کو لوٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو جیسے چونک گیا۔ یہ تولیہ بالکل میرا اپنا تولیہ ہے۔

اس نے میرے ہاتھ سے لے کر برتھ کی پچھلی سیٹ پر ٹانگ دیا اور ساتھ ہی میرا شکریہ بھی ادا کیا۔

میں نے کہا "شکریہ آپ اس بات کا ادا کر رہی ہیں کہ تولیہ میں نے رکھ نہیں لیا ہے، لوٹا دیا ہے؟"

"تو کیا یہ بھی ممکن تھا کہ آپ رکھ ہی لیتے" اس نے میرے سوال کا جواب سوال ہی سے دیا۔ اب میں اس سے دلچسپی لینے لگا تھا۔

"دنیا میں کیا چیز ممکن نہیں" میں نے گھسی پٹی بات کر دی۔

"ممکن ہونے سے جائز تو نہیں ہو جاتی"

اس نے پھر ذہانت کا ثبوت دیا۔

"لیکن کون ان دنوں جائز اور ناجائز میں فرق کرتا ہے؟" میں نے دھاندلی کی۔

"تو آپ نے اسی جائز اور ناجائز کی تفریق مٹانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے؟"

میں ہنس پڑا۔ اس ہنسی کے پیچھے کوئی ایسا جذبہ بے اختیار تو تھا نہیں ہو سکتا ہے کہ میں نے اس سے سمجھوتہ کر لینا ٹھیک سمجھا ہو۔ لیکن ایک بات

تو بالکل صاف تھی ـــــ وہ تولیہ میرا تھا جس سے میں نے سر خشک کیا تھا اور وہ یقیناً میرے سوٹ کیس سے نکالا گیا تھا۔ اسی سوٹ کیس سے جو ابھی ابھی یہاں رکھا تھا۔ جس پر میرا نام اور بحیثیت آرٹسٹ میرا پیشہ سب کچھ درج تھا اور جو اب غائب تھا۔

"آپ اپنے سوٹ کیس کے کھو جانے کی اطلاع پولیس کو دینے کے لیے ٹرین کی زنجیر بھی تو کھینچ سکتے تھے۔"

اس نے جیسے بعد از وقت مشورہ دیا۔

"لیکن وہ کھو یا کہاں ہے؟!" میں نے یہ جملہ کہہ کر جرأت سے کام لیا۔

"پھر ہو کیا گیا؟" ـــــ اس نے بھونچکا ہو کر کہنے کی کوشش کی۔

"آپ نے عورت ہونے کے ناطے شاید یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے کہ اپنے ہم سفر کی رکھوالی کریں۔"

"ہم سفر کی رکھوالی تو کی بھی جا سکتی ہے لیکن زادِ راہ اور ہم سفر ایک ہی تو نہیں ہوتے ـــــ" اس نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ صرف میری رکھوالی کریں گی؟"

"وہ تو کر ہی رہی ہوں۔"

"کیا کہا آپ نے۔"

"تولیہ دیا تاکہ آپ بال خشک کر لیں۔ اور آپ کی طبیعت ناساز نہ ہو۔"

"ہاں یہ تو سچ ہے ـــــ میں بھی کیا احسان فراموش ہوں۔" میں نے کہا۔

"احسان فراموش بھی۔ سامان فراموش بھی۔" اس نے پھر میری توجہ

سوٹ کیس کی طرف پھیر دی۔

"میں نے کہا نا کہ میں ـــــ سامان فراموش نہیں ہوں۔

"یہ تولیہ جو آپ کے پیچھے کھونٹی پر لٹکا ہوا ہے۔ اس بات کا شاہد ہو کہ میرا سوٹ کیس آپ نے کہیں بہت حفاظت سے چھپا رکھا ہے۔"

"آپ میری خوش مزاجی اور زندہ دلی کا مذاق نہیں اڑا رہے ہیں بلکہ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

یہ جملہ ادا کرتے کرتے وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"آپ غالباً اداکارہ ہیں" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"جی نہیں" اس نے کہا "میں تو آپ کی اداکاری اور کمال فن کی پرستار ایک تماشبین ہوں جو دیکھ دیکھ کر حیران ہوں کہ کس طرح چوری چوری سے جاتا ہے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔"

"بہت دلچسپ ہیں آپ ـــــ کہاں جا رہی ہیں۔ کیا کرتی ہیں؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

وہ بغیر کچھ جواب دیے اٹھی اور اس نے سوٹ کیس سیٹ کے نیچے سے باہر گھسیٹ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔۔۔۔ "یہی ہے نا وہ سوٹ کیس جس کی آپ کو تلاش تھی؟"

یہ سوٹ کیس میرے سوٹ کیس سے بہت ملتا جلتا تھا لیکن یہ میرا اپنا نہیں ہے ـــــ سوٹ کیس پہ بہت ہی واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔ "ونود چندرا ماتھر" آرٹسٹ

مجھ کو ذہنی اذیت سی ہوئی لیکن یہاں تو ایک عجیب ڈرامہ کھیلا جارہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ کیا چکر ہے۔ یہ اگر میرا سوٹ کیس نہیں ہے تو پھر میرا اپنا سوٹ کیس کہاں ہے اور یہ لڑکی مجھے آخر کیا سمجھ رہی ہے۔

"آپ نے کیسے جان لیا کہ میں بھی آرٹسٹ ہوں" میں نے پوچھا۔

"جاننا واننا کچھ نہیں ہے۔ اب آپ زیادہ چکر دینے کی کوشش نہ کیجئے کہ آپ کیا ہیں"

"پھر آپ نے مجھے میرے آرٹ کا حوالہ دیتے ہوئے ابھی کچھ دیر پہلے مخاطب جو کیا ہے؟"

"جی وہ تو طنز کیا تھا کیونکہ اس سوٹ کیس پر"

میں نے بات کاٹ دی "اچھا جی میں سمجھ گیا" آپ مجھے چور یا اچکا سمجھ رہی ہیں، لیکن مجھ سے اتنا شریفانہ برتاؤ کیوں روا رکھا آپ نے"

"کوئی ضروری نہیں کہ میں سب کچھ آپ کو اسی وقت بتلا دوں۔ ذرا صبر کیجئے اب اسٹیشن آہی رہا ہے"

گاڑی کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ بارش تھم چکی تھی۔ میں نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ رات بالکل تاریک تھی اور کمپارٹ منٹ سے نکلنے والی روشنی باہر پھیلی ہوئی تاریکیوں کے نرغے میں دم توڑ رہی تھی۔

ٹرین پلیٹ فارم پر رکی تو وہ اٹھی اور لپک کر اس نے دروازہ کھول لیا اور اتر کر سامنے ہی کھڑی ہو گئی۔ وہ بے چینی سے کسی کو ڈھونڈ رہی تھی اور

نکھیوں سے مجھے دیکھے جاتی تھی ــــ میں نے دیکھا گارڈ اور پولیس کانسٹبل
اس کی طرف تیزی سے آرہے تھے۔ اُس نے انھیں بتایا کہ اس کے اپنے سوٹ
کیس کے چور کو اُس نے خود پکڑ لیا ہے جو غلطی سے اس کے ڈبّے میں سوار ہو گیا
تھا ــــ اور وہ میں ہوں۔

گارڈ نے مجھے دیکھا تو بے اختیار ہنس پڑا۔ میری طرف بڑھتے ہوئے
اس نے پولیس کانسٹبل کو بریک سے میرا سوٹ کیس لانے کے لیے کہا ــــ پھر
اُس نے میرا تعارف میرے ہم سفر سے کرایا اور بڑی ہی لجاجت سے اس کی
غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

کانسٹبل میرا سوٹ کیس لے آیا تو کمپارٹمنٹ میں رکھنے کے بعد میری
ہم سفر نے میرے نام اور پیشہ کو غور سے پڑھا۔ پھر یکایک خود بھی قہقہہ مار کر
ہنس پڑی۔

میں نے اس سے معافی مانگی کہ میری وجہ سے وہ پریشان ہوئی۔
اس نے ہنس کر کہا کہ پریشان تو اب ہونا ہے اس لیے کہ گارڈ صاحب
نے بتلایا کہ اس کمپارٹمنٹ میں اوپر کی سیٹ آپ کے لیے ریزرو ہے۔
میں نے پیش کش کی کہ اس کو اس الجھن سے بچانے کے لیے میں کسی بھی
ڈبے میں بیٹھ رہوں گا۔

وہ مسکرائی ــــ کہنے لگی۔

"جب آپ کو اُچکا سمجھ بیٹھی تھی تو آپ سے انسانوں جیسا سلوک کیا،
اب جبکہ آپ ایک شریف آدمی کی حیثیت سے میرے ساتھ ہیں تو بھلا آپ

کی ہم سفر رہنے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔"

گارڈ نے سیٹی دی اور ہم دونوں کو ہنس کر خدا حافظ کہا۔

ہم ٹرین میں سوار ہو گئے تو میں نے اپنا سوٹ کیس کھول کر تولیہ نکالا اور اس کے آگے بڑھا کر اس سے خواہش کی کہ اپنی نشانی کے طور پر اپنا تولیہ اس تولیہ سے بدل لے جس سے میں نے اپنے بال خشک کیے تھے۔

اس نے مسکرا کر تولیہ مجھ سے لیتے ہوئے کہا کہ واقعی اتفاق سے یہ یہ دونوں تو بالکل ایک سے ہیں۔

ٹرین روانہ ہوئی تو میں اطمینان سے اس کے برابر بیٹھ گیا ظاہر ہے کہ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا بڑی معصومیت سے اس نے مجھے بتلایا کہ وہ مجھ سے بڑی خائف تھی اور ٹرین کے دوسرے اسٹیشن تک پہونچنے کے انتظار میں وہ بادل ناخواستہ مجھے رجھا رہی تھی۔ اس کے شریفانہ برتاؤ کا یہی ایک سبب تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اگر وہ چیخ پکار کرے گی تو میں مزاحمت کروں گا اور پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں۔ وشو چندرا ماتھر جس کا نام اس کے سوٹ کیس پر لکھا تھا اس کے والد تھے۔

ہم نے دلی تک یہ طویل سفر ساتھ ہی کیا ــــ میرا جی چاہتا تھا کہ ٹرین کی کہیں منزل ہی نہ ہو۔ یا پھر ہماری ہی منزل کا تعین نہ ہو اور ہم چلتے رہیں، چلتے رہیں ــــ وہ اس سفر میں مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔

اس کی شخصیت میں پندار کا وہ چھوٹا پن نہیں تھا جو مجھ کو اس کی اضطراری کیفیت اور بوکھلاہٹ میں شروع شروع نظر آیا تھا ــــ وہ

بڑی ذہین ملنسار اور خلیق الطبع تھی ـــ میں نے سوچا کہ اگر وہ زندگی کے سفر میں میری ہم سفر ہو جائے تو ـــ ؟!

لیکن میری زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ میں نے ایسی کوئی پیش کش کرنے کی جرأت نہیں کی۔

دلّی اسٹیشن پر ہم جدا ہونے لگے تو میں بھی خاموش تھا وہ بھی خاموش تھی۔

میں نے اس سے دبی زبان میں کہا " میں نے تمھارا سوٹ کیس چرایا نہیں تھا، تم جان چکی ہو۔ لیکن تم جو میری زندگی کی ساری پونجی چرا کر جا رہی ہو تو کیا میں تم سے شکایت بھی نہیں کر سکتا ؟"

اس نے نظریں جھکا لیں ـــ پھر جدا ہونے تک آنکھیں چار نہیں کیں ـــ میں ان جھکی جھکی نظروں کو دیکھ بھی نہ سکا۔

بہت سنبھل کر بڑے ہی اندرونی کرب سے اس نے کہا " ہمارے سماج میں کتنے ہی ہم سفر بڑی بے دلی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زندگی کا سفر طے کر رہے ہوں گے ـــ میں بیاہتا ہوں ـــ میری شادی بچپن ہی میں ہو گئی تھی "

میں نے سوچا اس کا باپ اتنا بڑا آرٹسٹ ہے۔ کتنی ہی تصویروں کا خالق ـــ لیکن اس کی سب سے عظیم ترین تخلیق رو رہی ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نمائش کے لیے میرے اپنے بنائے ہوئے سارے پورٹریٹ دھندلا گئے ہیں اور میں انھیں پہچان نہیں پا رہا ہوں۔

▬ ▬

درد کا رشتہ

تیسری ہیٹنگ میں جب گھوڑے اگزبیٹ ایریا (EXHIBIT — AREA —) میں لائے گئے تو میری نظر پانچویں گھوڑے پر جم کر رہ گئی۔ قد میں سب سے اونچا۔ ہاتھ پاؤں کا سب سے سیدھا۔ بوٹی بوٹی تھرکتی ہوئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے چھونے سے کرنٹ ہمارے جسم میں سرایت کر جائے گا۔ لیکن سارے میں باتیں ہو رہی تھیں "لے آف بنگال" کی۔ واقعی تھا بھی خوب۔ مگر میں تو بس۔ "فرینڈشپ" کا ہو رہا تھا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

"فرینڈشپ" کی گردن کے اوپری حصے میں گلے کے نیچے ایک گول سا بیتل کا حلقہ لگا ہوا تھا۔ دیکھنے میں ایسا لگتا جیسے لکڑی پر اسکرو سے فٹ

کیا گیا ہو۔

میں نے سنا لوگ کہہ رہے تھے کہ اس گھوڑے کو سانس لینے میں تکلیف کا عارضہ ہے اور چھوٹا پنیل کا حلقہ اسی مرض کے ازالے کے لیے ہو۔ وقتی طور پر سانس لینے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ لوگوں کا اعتماد اس "آرڈی فیشل بریدنگ شپ" پر سے اٹھتا جا رہا تھا۔

میں ٹوٹ کھیلنے کے لیے کھڑکی پر پہنچا تو بڑے تذبذب کے عالم میں تھا۔ "فرینڈ شپ" کی ونڈو پر بڑھوں یا "بے آف بنگال" کی؟ اس سے پہلے کہ میں قطعیت کے ساتھ کوئی اقدام کر سکتا میں نے لپک کر پہلے دو روپے کا سویپ خرید لیا — اس لیے بھی کہ اس اثنا میں مزید غور کر لوں۔

جی تو یہ چاہتا تھا کہ ٹوٹ کھیلنے کے بجائے بکیز پر کھیلوں۔ لیکن جیب تنگ تھی اور اس وقت اتنی حیثیت نہ تھی یا بقول کرشن چندر وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دل الگ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ عجب بے دلی کا عالم تھا۔ میں نے اپنی اندرونی آواز کے زیر اثر جس کو آپ الفتا (INTUITION) کہہ سکتے ہیں بڑھ کر "فرینڈ شپ" پر ون کا ایک ٹکٹ ونڈو سے خرید لیا۔

ریس شروع ہوئی تو فرینڈ شپ اسٹارٹ ٹو فنیش (START TO FINISH) سب سے آگے تھا۔

مجھے یقین تھا کہ اچھا بھاؤ ملے گا کیونکہ اس کی سانس لینے کی بیماری کی لوگوں میں عام طور پر تشہیر ہو چکی تھی اور اس پر بیٹ کم لگائی گئی تھی۔ ریس جیت

کہ جب آپ پیسہ وصول کرنے کے لیے "ونرس ونڈو" پر پہنچتے ہیں تو ہر وہ چہرہ جو اس سمت آتا نظر آتا ہے وہ کچھ ناپسندیدہ سا لگتا ہے۔

اگلی ریس میں ایک گھوڑے نے دو آدمیوں کو پانچ پانچ روپے پر دو ہزار روپے فی کس دیے تھے۔ بھاؤ کا اعلان ہوا تو ہم ونرس کو پانچ روپے کے ساڑھے آٹھ روپے ملے۔ یعنی ساڑھے تین روپے میری بھی جیت ہوئی۔ جی چاہا روپے بانٹنے والے سے کہوں کہ صاحبزادے باوجودیکہ تم اپنی عمر کے پچاس سال کھا چکے ہو، اپنے چارپائی کے خرچ کے لیے یہ سارے روپے رکھ لو۔ لیکن بس وہی بات مانع تھی کہ جیب ہلکی تھی اور دل خالی خالی تھا۔ اپنا غصہ اپنی ہی جھولی میں محفوظ کرتا رہا۔

ساڑھے آٹھ روپے لے کر جیب میں لوٹ رہا تھا تو عورتوں کی قطار میں تاجی مجھے اشارے سے بلا رہی تھی۔ تاجی بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ بہت حسین۔ اپنا جسم بڑے سلیقے سے برتتی ہے اور حتی المقدور اپنے جسم کی حفاظت کرتی ہے۔

میں اس سے پہلی بار جس وقت ملا تھا تو بہت اُداس ہو گیا تھا۔

اس کو تو کسی کے دل کی شہزادی ہونا چاہیے تھا۔

اس کو تو کسی کے گھر کی رونق ہونا چاہیے تھا۔

اس کو تو کسی کی زندگی ہونا چاہیے تھا۔ کسی کی روح۔ لیکن خود تاجی کی اپنی نہ کوئی زندگی تھی نہ کوئی روح۔ جو کچھ تھا بس جسم اور چہرہ تھا۔ ایسا جسم اور چہرہ جو ہر کسی کی زندگی بن سکتا ہے۔ ہر کسی کی روح۔

میں تاجی کے قریب پہنچا تو اس نے کہا ــ" میں نے فورکاسٹ بھی جیتا ہے ۔ تم مجھے یہ پیسے بھی لا دو۔ بھاؤ ابھی تک نہیں آیا ہے" اس نے اپنا فورکاسٹ کا ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ تو میں نے اس کو مبارکباد دی۔ اس نے گردن کو خم دے کر مبارکباد قبول کی اور کہنے لگی کہ وہ یہیں میری منتظر رہے گی ۔

میں نے پوچھا ــ" تم اکیلی ہو کیا ؟"

کہنے لگی " نہیں۔ سب بتاتی ہوں ۔ تم ذرا پہلے ہو آؤ ۔"

ہری ساری میں ملبوس تاجی قیامت معلوم ہو رہی تھی ۔ اس کا سبھاؤ۔ اس کی سج دھج ۔ اس کی سجاتا ۔ دھان کے کھیت کی ایک تازہ اور ٹھنڈی لہلہاہٹ تھی جو مجسم ہو کر رہ گئی تھی ۔ کتنی ہی نظروں نے اپنے تانے بانے میں اس کو جکڑ رکھا تھا ۔ لیکن وہ ان سب نظروں کو پہچان لینے کا گُر جانتی تھی کہ کون سی نظر کتنی دور تک اس کا ساتھ دے سکتی ہے ۔

میرا جی پھر چاہا کہ اس کو نظر بھر کر دیکھتا چلوں ۔ سو میں نے اس کو دیکھا۔ وہ مسکرائی تو لوگوں نے مجھے دیکھا اور میں لمحہ بھر کے لیے یہ بھول گیا کہ میری جیب بھی سبک ہے اور دل بھی خالی ۔

فورکاسٹ دو گھوڑوں کے بریکیٹ بنا کر کھیلنے کو کہتے ہیں ۔ مثلاً تاجی نے نمبر ۵ گھوڑے کو ون اور نمبر ۳ گھوڑے کو " پلیس " بنا کر کھیلا اور جیت گئی ۔ فورکاسٹ کی جیت پر بھاؤ نسبتاً بہتر مل جاتا ہے ۔

میں کھڑکی پر پہنچا جہاں فورکاسٹ کی جیت تقسیم ہو رہی تھی تو ایک

اژدہام تھا۔ میں سمجھ گیا کہ نمبر ۵ اور نمبر ۳ اکثریت کے پسندیدہ گھوڑے ہیں۔
بھاؤ کا اعلان ہوا تو صرف اکیس روپے تاجی کے حصّے میں آئے۔ یعنی دو روپے
ٹکٹ کی رقم منہا کرنے کے بعد سولہ روپے اس نے فورکاسٹ پر جیتے تھے اور
ساڑھے تین روپے دن پر جو وہ خود حاصل کرنے کے لیے کیڈمین کھڑی تھی
جہاں میں اسے ملا تھا۔ اس طرح اس کے لگائے ہوئے دس روپوں کے علاوہ
اس کو ساڑھے انیس روپے مل گئے تھے۔ یہ رقم گو بہت معمولی تھی لیکن کیا
معلوم تاجی کس عالم میں ریس کورس تک آئی تھی۔
میں پیسے لے کر اس مقام پر پہنچا جہاں تاجی نے بتایا تھا کہ وہ میری
منتظر رہے گی لیکن تاجی وہاں نہیں تھی۔ میں کچھ دیر وہاں ٹھہر کر اس کا انتظار
کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔

اس دن کی چوتھی ریس ہونے والی تھی۔ لوگ بکیز اور رونڈ وز کی طرف
جوق در جوق بڑھ رہے تھے۔ میں کچھ طے نہیں کر سکا تھا کہ کس گھوڑے پر
کھیلوں یا پھر اس بار کھیلوں بھی یا نہیں۔ اس تذبذب کے عالم میں میں "انکلوژر
ایریا" کے قریب پہنچ کر گھوڑوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ عجب مایوسی کا عالم تھا۔
سامنے ٹہلنے والے گھوڑوں پر نظر تھی۔ لیکن دل و دماغ کہیں اور تھا۔ "کمودنی"
اور "البیلا چھیلا" کی بڑی تعریفیں تھیں۔ کمودنی تھی تو بڑی پیاری گھوڑی
لیکن "البیلا چھیلا" کی ہسٹری بہت شاندار تھی۔ میں نے فورکاسٹ میں اس
کو ون اور کمودنی کو پلیس رکھ کر کھیلا۔
میں گھر سے چلا تھا تو تیس روپے میری جیب میں تھے۔ قرض خواہوں

کی یورش سے بچا کر یہ تیس روپے یہاں تک لانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ آدھی مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں جگنو کی چمک کو راستے کی روشنی سمجھ بیٹھے تو اس میں بیچارے دل کا کیا قصور ہے۔ پاسبان عقل ساتھ نہ تھا، لیکن دل کو تنہا چھوڑنے کے یہ معنی بھی تو نہ تھے کہ عزیب بھائیں بھائیں کرتی ویرانیوں کا ہو رہے۔

میں نے ریس کورس میں قدم رکھا تھا تو چھ روپے داخلہ ٹکٹ کے صرف ہو گئے۔ اب صرف چوبیس روپے تھے۔ امیدوں کا ڈانڈا میرے ساتھ اس طرح چل رہا تھا جیسے اندھے لنگڑے بھکاریوں کا ایک غول میرے جلو میں ہو۔

امیدیں سورج کی پہلی کرن کی مانند دل کے تاریک گوشوں میں داخل ہوں تو خواہ کچھ حاصل ہو کہ نہ ہو حوصلے تو بڑھ جاتے ہیں لیکن یہی امیدیں اندھوں کی طرح دل کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتی پھریں تو!

مہینے کی نو بیں تاریخ تھی۔ مجھے چالیس روپے تو عدالت خفیفہ میں قرض کی پہلی قسط کے طور پر دسویں کو ادا کرنے تھے ورنہ تارا چی ولد برج جی قرقی لا کر گھر کا سامان اٹھا سکتا تھا۔ مالک مکان کا کرایہ الگ ادا کرنا تھا۔ ساٹھ روپے بطور کرایہ مکان میں ہر ماہ پیشگی ادا کرتا آیا ہوں۔ ایک ماہ کا کرایہ کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ اس کے باوجود مالک کا اتنا تقاضہ تھا کہ جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر خود اسی کے دل میں جا چھپوں اور کچھ اس طرح گدگداؤں کہ اس کو مجھ پر ترس آجائے۔ چھپنے کے لیے یہ مقام میں نے اس لیے تجویز کیا تھا کہ اس کے سوا دنیا کے کسی خطے میں بھی جا چھپتا تو وہ مجھے میرے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی کی وساطت سے

ڈھونڈ نکالتا۔ لیکن یہاں جا چھپنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا گھر چھوڑ کر آسمان کے نیچے زندگی گزارنا۔

دودھ والی کے تقاضوں میں اتنی نرمی اور لچک رہتی جتنی نرمی اور لچک خود عورت کی فطرت میں رہتی ہے۔ یہاں پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹنے کی بات ہی نہیں تھی۔ لوہا لوہے کو کاٹتا تھا اور بس۔ میری بیوی اس سے نمٹ لیتی ہے۔

قصہ مختصر فوری طور پر ادا کرنے تھے ایک سو چالیس روپے اور گھر میں دھرے تھے صرف تیس روپے۔ جو میں نے "البیلا چھبیلا" اور "کمودنی" پر کھیل کر ہار دیے اور جو کچھ بچا تھا وہ سوئپ کی نذر ہوا۔

میں نے کہانی شروع کی تھی۔ ریس کورس سے اور آپ کو چل دے کر آیا ہوں اپنے گھر ——— کہاں ریس کورس اور کہاں میرا گھر۔ گویا میں جنت کی سیر کراتے کراتے آپ کو جہنم میں گھسیٹ لایا ہوں۔ میں بور نہیں کروں گا۔ یہ کہانی میرے گھر کا ہی کھاتہ تو ہے نہیں کہ میں کہانی کے بہانے آپ کو اپنے قرض کی پائی پائی کا حساب بتا دوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ قرض کی ودیعت کردہ اس اداسی سے ریس کورس کی چہل پہل کا ناتا ضرور ہے۔ میرے گھر کے جہنم سے ریس کورس کی جنت کا کچھ رشتہ بھی ہے۔ اور وہ ناتا رشتہ صرف اس قدر ہے کہ میں اپنی اس مادی اور اداس زندگی سے بھاگ کر پہلی ریس ہی میں گھر کی ساری پونجی مبلغ تیس روپے لے کر آنکھیں بند کیے اس طرح کود پڑا تھا جیسے کوئی ہندوستانی سپاہی اپنا گھر بار چھوڑ کر انگریزوں کی بقا کے لیے جنگ لڑنے کو محاذ پر چلا جائے۔

ویسے ریس کورس پر میں کئی بار جا چکا تھا لیکن ایسے تماشائی کی طرح جو نہ کسی کے جلتے ہوئے گھر پر پانی کے دو چھینٹے دے سکتا ہے نہ بنتے ہوئے محل کی بنیاد میں ایک پتھر اپنے ہاتھ سے رکھ سکتا ہے۔ نہ کسی کے لٹ جانے پر ہمدرد کا ایک لفظ، نہ یکایک بن جانے پر خوشی کا کوئی کلمہ۔

میرے ایک دوست تھے کیپٹن مسعود ــــ وہ اپنی کپتانی مجھ پر اس حد تک چلاتے تھے کہ میں ان کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ ہم ریس کورس پر داخل تو ہوئے مل جل کر گھر کے دوستوں کی طرح ــــ پھر ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو دو دو گھنٹے ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہوئی۔

میدانِ حشر میں سنتے ہیں کہ نومولود اور شیر خوار بچے بھی جو اس چھوٹی سی عمر میں ماں باپ سے جدا ہو گئے تھے سونگھ کر انھیں پہچان لیں گے۔ لیکن ریس کورس کے میدان میں ایسے ایسے کڑے وقت آتے ہیں کہ نوجوان بیٹا ادھیڑ باپ کو نہیں پہچانتا۔ نہ باپ بیٹے کو۔ چہیتی بیوی چاہنے والے شوہر کو نہیں پہچانتی۔ نہ چاہنے والا شوہر چہیتی بیوی کو۔ لوگ گلے بھی ملتے ہیں۔ بچھڑتے بھی ہیں۔ وہ جو ابھی دس منٹ پہلے آپ سے گلے مل کر گیا تھا۔ دس منٹ بعد ہی سر نگوں و گم دار ملے گا اور وہ جس کو دنیا بھر کا مظلوم جان کر آپ لائق توجہ نہیں سمجھ رہے تھے اس قدر بشاش بکی کی جانب دوڑتا ہوا نظر آئے گا جیسے خود جیتا ہوا گھوڑا ہو۔

جہاں منٹ بھر میں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہوں۔ جہاں کھڑے کھڑے جیب کے فونٹین پن کیا ہاتھ کی گھڑیاں کیا کاریں تک

بک جاتی ہیں وہاں چوبیس روپے کی حقیر رقم اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے آج میں بھی ریس کورس کی دنیا میں عملی طور پر حصّہ لینے کے لیے شامل ہو گیا تھا اور کیپٹن مسعود الزماں کو جُل دے کر آگ کی لپٹوں میں کود پڑا تھا کہ دیکھوں نارِ نمرود گلزار بنتی ہے کہ نہیں۔

اپنے دوست مسعود کو جُل دینے کی ضرورت مجھے اس لیے پیش آئی کہ اس کے اصرار پر بھی میں نے ہمیشہ ریس کھیلنے سے انکار اور گریز کیا۔ اوّعا یہ تھا کہ بھری برسات میں آسمان کے نیچے کھڑا رہوں گا لیکن سر پہ نہ بوند پڑے گی نہ اولے برسیں گے۔ آج یہ سارے دعوے باطل ٹھہرے اور مکان مالک اور تاراچند ولد برج جی نے دل کو ہو کر کے رقصِ بسمل کے لیے ریس کے میدان میں مجھے پھینک دیا۔ لیکن تاجی یکایک مل گئی تو میں نے سوچا ــــــ ولے نازم بر این فرشتے کر پیش یار می رقصم۔ لیکن وہ انتظار کرنے کے لیے کہہ کر ایسی گئی کہ کوئی نہیں! ادھر میں ریس کورس کے اس محشرستان میں پھر تنہائیوں کا ہو کر رہ گیا۔

چوتھی ریس اسی تذبذب کے عالم میں میں نے کھیلی تھی۔ میں دو روپے کا سوئپ لیا اور ہار بیٹھا۔ جب میں بلیٹ پہ لگے ہوئے سوئپ کے نمبروں سے اپنے ٹکٹ کا نمبر ملا کر دیکھ رہا تھا۔ میرے برابر کھڑا کوئی آدمی یکایک چیخ پڑا "اے بھگوان" اور دھوتی سنبھالتا ہوا اگسٹ بھاگنے لگا۔ میں نے دو جست میں اس کو قریب ترین جیسے دبوچ لیا۔

"ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ کہ کیا ہوا؟" ــــ میں نے اضطراری کیفیت میں پوچھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے بانہہ چھڑائی ــــ "پہلا نمبر آیا ہے جی ــــ بھگوان کی

کر پاسے "۔۔۔ الفاظ اس نے دوڑتے دوڑتے ہی ہانپ کر ادا کیے ۔۔۔ میں نے ٹھہر کر دیکھا تو اس کی دھوتی پیروں میں اڑس کر کھل گئی تھی اور وہ بھاگتے ہوئے ہی اس کو برابر کیے جا رہا تھا۔ تن و توش سے کوئی سیٹھیا معلوم ہوتا تھا۔
سوئچ کی تختی پر پہلے نمبر کے محاذی بارہ سو بیالیس روپے کا نیگر جیسے میرے منھ پر تھوک رہا تھا ۔۔۔ اے بھگوان بڑی کرپا ہے، اے بھگوان تیری لیلا۔
"کیا سوچ رہے ہو؟" تاجی نے پیچھے سے میرا ہاتھ دبایا اور اس سے پہلے کہ میں مڑ کر اس کو دیکھتا وہ خود میرے مقابل آگئی۔
"کہاں تھیں تم ملیں کیوں نہیں۔ مجھے انتظار کروایا"
اس نے کہا" معاف کر دو مجھے" اور میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس کے اس پیار بھرے انداز سے میں نے بھائیں بھائیں کرتے دل میں کسی کے نازک اور نرم قدموں کی چاپ سُنی۔
"تم اکیلے ہو تو میرے ساتھ رہو" میں نے بہ اصرار کہا۔
وہ میرے ہاتھ چھوڑ کر میرے بھولپن پر ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔
"تو کیا میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ اکیلی رہا کروں؟"
میں شاید اس کی انا کی خوبصورتی پر ہنس سکتا تھا۔ لطف اٹھا سکتا تھا مگر ابھی ابھی میں نے اپنے دل میں جن قدموں کی نرم و نازک چاپ سُنی تھی انہی قدموں نے گویا مجھے ٹھوکر لگائی اور میں خود پر ترس کھا کر رہ گیا۔
اس نے پھر میرے ہاتھ تھام لیے، لیکن میں نے اس بار اپنے دل میں کوئی آواز نہیں سُنی۔

وہ بچوں کی طرح پچکار کر کہنے لگی ـــ "میں اس وقت بڑے موٹے اسامی کے ساتھ ہوں۔ وہ کیپٹن کے کاؤنٹر پر کھڑا بیئر کا باٹل غٹار رہا ہے۔ ادھر دو ماہ سے مجھ پر بے دریغ خرچ کرتا رہا ہے۔ آج مگر بیچارہ بہت ہار رہا ہے۔ جیت لیتا تو میرے بھی ٹھاٹ ہوتے۔ سب کچھ ہار چکا ہے۔ ابھی دو دوڑیں باقی ہیں نا۔ بس اسی کے لیے رقم فراہم کرنے کی فکر میں باہر جا رہا ہے۔"

"باہر جا رہا ہے تو اس کو چھوڑ کر یہاں چلی آئی ہو؟"

میں نے طنز کیا ـــ لیکن تاجی نے مسکرا کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے جان گئی ہو کہ میں بچے کی ضد کر رہا ہوں۔ اس نے میری بات کا بالکل برا نہیں مانا۔ کہنے لگی "کسی کی ہار جیت کے ساتھ میرے جسم و جان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

پھر اپنی ہتھیلی کھول کر میرے آگے اس نے پھیلا دی اور اپنے دوسرے ہاتھ سے میرا ایک ہاتھ تھاما، اسے اٹھایا اور اپنے کھلے ہوئے ہاتھ پر دوران گفتگو مارتی رہی۔ اس کی چاہت کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ اس کے پیار کے انداز انوکھے۔

اپنے بھائیں بھائیں کرتے دل میں پھر کسی کے قدموں کی چاپ میں سننے لگا ہوں۔

"تو تم اس کے ساتھ نہیں جاؤ گی؟" میں نے بے صبری میں جان لینے کے لیے کہ وہ میرے ساتھ رہے گی۔" پوچھا۔

"وہ خود مجھے یہاں چھوڑ کر جا رہا ہے تاکہ میں بوڑھے کاؤنٹ ہارٹن کی تلاش کر کے کسی نہ کسی طرح اس سے ملوں۔"

میں سمجھ گیا۔ بوڑھا کاؤنٹ ہارٹن بہت ہی مشہور پنٹر (PUNTER) تھا۔

لوگ ایسے وقتوں میں اکثر اس کی ٹپ لے کر کھیلنے کے لیے اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ کبھی جیت بھی ہوتی کبھی ہار بھی جاتے۔ ہوتا وہی جو بہرحال ہوتا ہے۔ لیکن ڈوبتا تو تنکے کا سہارا ابھی ڈھونڈتا ہے نا!

"چلو۔" اس نے میری بانہہ پکڑ کر کہا "کاؤنٹ ہارٹن کو ڈھونڈیں۔"

ہم دو چار قدم بڑھے تھے کہ اس نے مجھے اشارے سے بتایا "وہی ہے جس کے ساتھ میں ہوں۔"

ایک بھاری بھرکم لیکن شکیل سا نوجوان گرے رنگ کا فل سوٹ پہنے کینٹین سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کی نظروں کی بے چینی بتا رہی تھی کہ وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ تاجی نے میرا ہاتھ دبا کر کہا "وہ میری تلاش میں ہے۔" اور اس نے جھٹ سے اپنی پرس کھول کر کچھ نوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما کر کہنے لگی۔

"انھیں بھی رکھو۔ اگر میں ان دو ریسوں میں بھی تمھیں نہ ملوں تو خواہ کتنی ہی دیر ہو تم یہیں باہر گیٹ پر میرے منتظر رہنا۔"

اس نے پرس کا زپ بند کیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھ سکوں اپنا خالی پرس ہلاتی ہوئی اٹھلا کر تیز تیز قدم اٹھاتی نوجوان کی طرف چل دی۔

اس کے ہاتھ میں خالی پرس مجھے اس طرح لگا جیسے اپنے سینے میں میرا اپنا خالی خالی دل۔ میں ان دونوں کو باہر جانے والے گیٹ کی طرف جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ نوجوان اور تاجی میرے قریب سے گزرے تو تاجی نے بڑے بانکپن اور رکھ رکھاؤ سے مجھے سلام کیا۔ جیسے ابھی ابھی مجھ سے مل رہی ہو۔ میں نے دیکھا

بھاری بھرکم نوجوان کچھ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ اس نے تاجی کے اور میرے پیام وسلام کو کچھ اہمیت نہ دی، نہ نظر اٹھا کو مجھے دیکھا ہی۔ اس کی سوٹیڈ بوٹیڈ شخصیت میں ٹھاٹ کا پیوند لگانے والی اس کی ہیرے کی بالیاں تھیں جو اس نے کانوں میں پہن رکھی تھیں۔ پتہ نہیں ان بالیوں کو دیکھ کر اس کی جاذب نظر شخصیت مجھے کیوں کچھ چھوٹی چھوٹی سی کچھ معمولی معمولی سی نظر آنے لگی۔

وہ گیٹ سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا تاجی ہاتھ ہلا کر واپس لوٹ رہی ہے وہ بڑی فاتحانہ چال چل رہی تھی۔ ایسا خرام ناز جو کبھی حُسن کا پندار بن جاتا ہے۔ میرے قریب آکر اس نے کہا۔

"چلو چھٹی ہوئی"۔

"کیسی چھٹی"؟" میں نے سوال کیا۔

"اب میں نہیں سمجھتی کہ وہ آخری دوڑ سے پہلے آئے گا بھی"۔

"کیوں نہیں آئے گا؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"رقم جو فراہم کرنی ہے اس کو۔ بینک بند ہو چکے ہیں"۔

"کانوں میں ہیروں کی بالیاں جو ہیں ــــ سو کس دن کے لیے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو منّت کی ہیں۔ کاشی میں اتریں گی ــــ ریس کورس پر نہیں"۔

تاجی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ہیرے کی بالیوں والا نوجوان دل کا بُرا نہیں۔ "لیکن ہارتا ہے تو جیتنے کی توقع میں پاگل ہو جاتا ہے"۔ اُسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن اس نے کاؤنٹ سے ٹپ لینے کا لالچ دے کر اپنا پنڈا چھڑا لیا ہے۔

"لو ـــــ تم یہ اپنی امانت سنبھال لو" ـــ میں نے پیسے اس کی طرف بڑھائے ـــ اور اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں ـــ نہیں ـــ ابھی یہ اپنے ہی پاس رکھو۔ میں ان کا مصرف تمہیں بتاتی ہوں "

"کتنے ہیں ؟" میں نے پوچھا۔

"بس چوراسی روپے ہوں گے" اس نے بتایا۔

میں نے دہیں گن کر دیکھا۔ پہلے بھی اس نے اکیس رکھوا رکھے تھے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے ـــ اور اپنی جیب میں محفوظ کر لیے۔

"اپنے ساتھی سے پیسے چھپاتی ہو کیا " میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ورنہ وہ یہ بھی ریس میں ہار دے گا ـــــ میں خود تمہیں سب کچھ بتانا چاہتی ہوں لیکن تم صبر بھی کر سکو "

مجھے اس پر پیار آیا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے ہونٹوں کو چوم کر رہ گیا، اس لیے بھی کہ یہاں کتنی ہی نظروں نے ہمارے اطراف جال سا بن رکھا تھا اور اگر یہ جال نہ بھی ہوتا تو۔

تاجی اپنا جسم بڑے سلیقے سے برتتی ہے اور حتی المقدور اپنے حسن کی حفاظت کرتی ہے۔

ـــ وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے ـــ بہت حسین۔

اس نے یکایک میرا ہاتھ پکڑ کر کینٹین کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا ـــ

"چلو پہلے کچھ کھا پی لیں۔ پتہ نہیں کھوسٹ کاؤنٹ وہیں مل جائیں۔"
ہم کینٹین کی طرف مڑ گئے تو میں نے پوچھا۔
"اس دوڑ میں کسی گھوڑے پر کچھ نہیں لگاؤ گی؟"
"بالکل نہیں ـــــ اب آخر تک کسی دوڑ میں کچھ نہیں لگاؤں گی ـــــ اسّی روپے مجھے اپنے بھائی کو دینے ہیں ورنہ وہ امتحان میں بیٹھ نہ سکے گا۔"
میں جانتا تھا تاجی کا ایک بڑا بھائی تھا جو یونیورسٹی میں ڈگری کورس کر رہا تھا اور یہ اس کا آخری سال تھا۔
"تم چاہو تو کھیلو۔" اس نے جیسے چونک کر کہا۔
میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ خاموش رہی ـــــ پھر اس نے خود ہی پوچھا ـــــ "کتنا ہار گئے ہو؟"
"کتنا جیت گئے ہو پوچھو ـــــ" میں نے اپنی شانِ استغنا تبلائی۔
"تم اسی طرح جیتتے رہے ہو۔" اس نے میری باہنہ میں چٹکی بھری اور ہم دونوں دن بھر میں پہلی بار کھل کر ہنس سکے۔ کاونٹر پر پہنچ کر اس نے کہا "مجھے کیا پلاؤ گے؟"
اور میں نے اس طرح تڑپ کر اسے دیکھا جیسے میری جیب بھرے بازار میں اس وقت الٹ کر رہ گئی ہوں جبکہ میں چیز پسند کر کے بھاؤ طے کر رہا تھا۔
"میں سب جانتی ہوں۔" اس نے مجھ سے بہت قریب ہو کر مجھے گدگدایا۔ جیسے میرے احساسات کی جو انتیس سیمنٹ کر اطراف ہنسنے والوں کے منھ پڑے مارے گی۔

میں اس کی خاطر مسکرا سکا اور اس سے نظریں چار کیں۔
مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں نے میری آنکھوں کو چوم لیا ہے۔
"تم اپنی پسندیدہ بیئر پیو" ــــ اس نے پیش کش کی۔
میں انکار کر گیا۔
"پینا پڑے گی۔ میں اتنا ہی خرچ کروں گی۔ جتنا میں کر سکتی ہوں تم مطمئن رہو" اور اس نے گولڈن ایگل بیئر کا آرڈر دے دیا اور اپنے لیے کوئی دو قسم کی آئس کریم منگوائی۔
میں نے آئس کریم کی اتنی دیوانی لڑکی نہیں دیکھی ــــ برف گر رہی ہو۔ آپ آئس کریم اس کی طرف بڑھا دیجیے۔ وہ بڑی شریر نظروں سے آپ کی طرف دیکھے گی ــــ پھر وہ نظریں جن کے دیکھنے سے ایسا لگے جیسے اپنی ہماری ہستی ڈھل رہی ہو بڑی ممنون دکھائی دیں گی۔
میں نے بیئر کا گلاس بھرا ہی تھا کہ اس نے جھک کر مجھے قریب ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کی طرف جھک گیا تو اس نے کہا۔
کچھ دیر توقف کر کے ذرا اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھنا۔ یہ صاحب بہت دیر سے میرا تعاقب کر رہے ہیں"
"تمہارا تعاقب تو یہاں کتنی ہی نظریں کر رہی ہوں گی اور وہ نظریں ہی کیا جو تمہارا تعاقب نہ کریں"
وہ کہنے لگی ــــ "یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ کون سی نظر کتنی وزنی

تک میرے ساتھ چل سکتی ہے۔"

"تو کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ نظریں دور دور تک تمہارا ساتھ دیں گی ؟"

"دور دور تک نہیں بس کچھ ہی دور تک اور یہی غنیمت ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا ــــ اور جیسے میرا خون کھول کر رہ گیا ــــ وہ تو ہمارے گھر کا مالک تھا۔ ہمارا لینڈ لارڈ۔ ساٹھ کے پیٹے میں دوہری ہڈی کا آدمی ــــ میں نے فوراً منھ پھیر لیا۔

تاجی بڑی تیز لڑکی ہے۔ وہ میری نظروں سے تاڑ گئی کہ اس شخص کو نہ صرف یہ کہ میں جانتا ہوں بلکہ ناپسند بھی کرتا ہوں۔

"کیا بات ہے ؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" میں نے کہا۔ میں انھیں جانتا ہوں۔ بڑے اصول پسند آدمی ہیں۔ میں انھیں کے ایک مکان میں کرائے پر رہتا ہوں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔"

"میں نے صحیح سمجھا نا کہ یہ نظریں دور تک میرا ساتھ دے سکتی ہیں ؟" تاجی نے مجھ سے استفسار کیا۔

"میں نے ایسا کوئی علم نہیں پڑھا ہے" میں نے خشونت سے کام لیا جس کا مجھے فوری دکھ بھی ہوا لیکن میں کچھ ایسے ہی موڈ میں تھا کہ دل توڑ کر غم نہ کروں ــــ اور یوں گزر جاؤں جیسے یہ ابھی ابھی جو ایک چھناکا سا میرے کانوں سے ٹکرایا ہے۔ وہ راستے میں پڑے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے سے کسی پیر کے چھو جانے کا چھناکا ہے۔

منٹ بھر کے لیے ہم دونوں پر خاموشی طاری رہی۔
مجھے محسوس ہوا "تاجی نے بہت اثر لیا ہے۔
"غصے میں کبھی آئینہ دیکھا ہے؟" ـــــ میں نے مصالحت کرنے کے لیے
پوچھا۔
"وہ آئینہ نہیں دیکھا جو بڑی بے دردی سے تم دکھاتے پھرتے ہو۔"
میں دل مسوس کر رہ گیا اور نظریں جھکا لیں۔
مجھے خاموش دیکھ کر اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ـــــ میں
نے اس کے باوجود نظریں چار نہیں کیں تو اس نے چمچہ بھر کر آئس کریم میرے
ہاتھ کی پشت پر ڈال دی۔
میں نے اس کو دیکھ کر کہا ـــــ "معاف کر دو مجھے۔"
وہ مسکرا رہی تھی ـــــ میں نے اتنی زخمی مسکراہٹ زندگی میں کاہے کو
دیکھی ہوگی۔ لیکن میں تو مسکرا بھی نہ سکا تھا۔ تاجی مجھے سہارا دے رہی تھی۔
جیسے میں زندگی کے ناہموار راستہ پر منھ کے بل گر پڑا ہوں۔
"لاؤ مجھے آئس کریم کھلا دو۔"
میں نے اپنے ہاتھ کی پشت جس پر سے اب آئس کریم پگھل کر بہنے لگی تھی
اس کی جانب بڑھا دی تو اس نے اپنے ہونٹ اس پر رکھ دیے۔ آئس کریم کھا
چکی تو آہستہ سے مجھے کاٹ کھایا۔
میں ہنس پڑا تو مجھے ہنستا دیکھ کر بہت خوش نظر آئی۔
میرے ہاؤس اونر نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ مجھے

تسکین سی ہوئی۔ میں بیئر پی چکا تو اس نے کہا۔

"چلو پنکج کو دیکھتے ہیں۔" اس نے بتایا کہ پنکج اس کے اسی ساتھی کا نام ہے۔ میں اس طرح اٹھ کر کینٹین سے نکل آیا جیسے اپنے مالک مکان کی موجودگی سے واقف ہی نہیں ہوں۔ تاجی نے بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

ہم پنکج کا اس کے بتلائے ہوئے مقام پر انتظار کرتے رہے۔

لوگ باتیں کر رہے تھے کہ ایک فلوک گھوڑے نے اس دوڑ میں بہت غیر متوقع بھاؤ دیتے ہیں۔ میرے دل پر یہ باتیں جیسے تیر بن کر لگ رہی تھیں لیکن میں نے تاجی کو اس کا احساس ہوتے نہیں دیا۔ آخری دوڑ کے شروع ہونے کا وقت بھی قریب آیا لیکن پنکج نہیں آیا۔

تاجی مجھ کو مضطرب سی نظر آنے لگی۔ اس کا یہ اضطراب مجھے پھر سنجیدگی اور خاموشی کی طرف لے چلا۔

"پنکج کے لیے بیقرار ہو؟" میں نے چوٹ کی۔

اس نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔ "ہو بھی سکتی ہوں۔ تمھارے لیے بیقرار ہونے سے تو رہی۔ کبھی کبھی مل جاتے ہو تو تمھارے ناز بھی اٹھاتی ہوں۔ تمھیں تو دکھ پہنچانے میں مزہ ملتا ہے۔ تم اور دے بھی کیا سکتے ہو؟"

تاجی مجھے چوٹ کھائی ہوئی ناگن نظر آئی۔

لیکن اس ناگن نے مجھے اس طرح ڈس لیا تھا کہ میرا جانبر ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کی حق گوئی۔ اس کی صاف گوئی سے میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔

میں نے پہلی بار اس کو منانے میں پہل کی۔ ہنس کر میں نے اس کو گدگدایا

"آج تم دل کھول کر مجھ پر خفا ہوئی ہو۔ میں تمھارے ضبط کو آزما تا رہا ہوں۔ جیت ہمیشہ تمھاری ہوتی ہے، لیکن آج میں اس لیے خوش ہوں کہ میری جیت ہوئی ـــــ"

"میں تو ہمیشہ ہی ہارتی رہی ہوں۔ لیکن اس ہار جیت میں دھرا ہی کیا ہے۔ پل بھر کو ملنے والے مسافر جیت جائیں تو کیا۔ ہار جائیں تو کیا۔"

"بہت سمجھ دار ہوتی جا رہی ہو" میں نے پھر اس کی تعریف کی۔

"تم ملتے ہو تو پتہ نہیں اتنی ساری سمجھ بوجھ کہاں سے آجاتی ہے۔"

"یہاں پھر میری ہی بڑائی ہوئی" ـــــ میں نے کہا۔

"میں نے کب اس کو تسلیم نہیں کیا۔" اور وہ اس طرح تن کر مسکرائی جیسے میری بڑائی پر فخر کر رہی ہو۔ مجھے اس کی یہ ادا بہت بھائی۔

اس نے گھڑی دیکھ کر بڑی لجاجت سے کہا۔

"میرا ایک کام کر دو گے؟"

میں نے بہت ہی ادب سے جھک کر کہا۔ "میں ہر حکم بجا لاؤں گا۔"

اس کے چہرے پر میں نے خوشی کی ناچتی ہوئی ان گنت کرنیں دیکھیں۔

"اس قدر خوش کیوں ہو" ـــــ میں نے پوچھا۔

"تم پر حکم چلانے میں مزہ مل رہا ہے ـــ" اس نے فوری جواب دیا۔

"حکم تو تم بیسیوں پر چلاتی ہوگی؟"

"ٹھیک ہے لیکن یہ لطف کبھی نہیں آیا۔ یہ سکون کبھی نہیں ملا۔"

"اچھا جی ـــــ تو چلو تمھیں خوش کیے دیتے ہیں۔"

لیکن وہ چونکی نہیں، کہنے لگی "اس خوش کرنے میں کہیں تمھاری اپنی خوشی بھی تو پوشیدہ نہیں ہے؟"

مجھے اس کو جھٹلانا کچھ اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی میں نے کہا۔ "تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتی ہو کیا مضائقہ ہے۔"

اس نے اسّی روپے میرے ہاتھ میں رکھ کر کہا "یہ بھائی کو پہنچا دو۔ وہ ماؤنٹی پر میرا منتظر ہو گا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں خود آؤں گی۔ ارادہ تھا ریس کے دوران ہی میں پنکج کی کار میں ماؤنٹی تک ہو آؤں گی، لیکن پنکج ابھی آیا نہیں ہے۔ بھائی منتظر ہو گا۔ اس کو شام تک یونیورسٹی پہنچنا بھی ہے۔"

میں نے روپے لے کر اس سے جانے کی اجازت چاہی تو اس نے کہا۔ "ہاں! شاموتو ایک بات کہوں۔ ریس کے ختم ہونے تک میں پنکج کا یہیں انتظار کروں گی لیکن اب مجھے اس کے آنے کی امید کم ہے۔ مایوس ہو کر کہیں پینے کے لیے بیٹھ گیا ہو گا۔ ریس ختم ہوتے ہی میں ماؤنٹی پر تم سے ملوں گی۔"

"اور اگر پنکج آ جائے تو میں رات بھر ماؤنٹی کے گیٹ پر کھڑا تمھارا انتظار کروں؟"

"بالکل نہیں — وہ اگر آ جائے تو بھی میں تمھیں خدا حافظ کہنے کے لیے وہاں آؤں گی۔"

میں منھ سے کچھ نہ پھوٹا — بس سر ہلا کر وہاں سے چلا آیا۔

ماؤنٹی پر تاجی کا بھائی اس کا منتظر تھا — اس نے شکریہ ادا کیا اور بس پکڑ کر چلا گیا۔ وہ جا چکا تو میں تاجی کے انتظار میں ماؤنٹی پر کھڑا رہا۔ لیکن تاجی میرے دل و دماغ میں کہیں نہیں تھی۔ دل میں اس کی جگہ پھر انہی بھائیں بھائیں

کرنے ستاؤں نے لے لی تھی جنھیں میں گھر سے لے کر چلا تھا۔ ان ستاؤں میں مالک مکان اور تاراجی ولد برج جی ہرنیوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ میں نے اپنی انگلیاں جیب میں ڈال کر جو کچھ بچ رہا تھا نکالا ـــــ ۸ نئے پیسے کل کائنات تھی ـ جی چاہتا تھا اب تاجی نہ ہی آئے تو اچھا ہے ـــ میں کہاں کہاں اس کی ہنس ہنس کر دلداری کر سکوں گا۔ بعض وقت کتنی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں زندگی کے کتنے بڑے امتحان لیتی ہیں۔ میں تاجی سے صرف اسی لیے بھاگ رہا تھا کہ ہنسی اس وقت میرے بس کا روگ نہیں تھی۔

میں نے سوچا کیوں نہ سامنے سے آتی ہوئی بس پر سوار ہو جاؤں۔

تاجی مجھے نہ پا کر چلی جائے گی۔

بس رکی تو میں اسی کشمکش کے عالم میں اس کی طرف بڑھا ــــ دو آدمی لپک کر اس میں سوار ہو گئے۔ کنڈکٹر نے سیٹیں فل ہو جانے کا اظہار اشارے سے کیا اور بس بڑھ گئی۔ میں ذرا پیچھے ہٹا تو کسی سے ٹکرایا۔ دیکھا تو تاجی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

اس نے کہا "صرف ایک بات مان لو"

میں انکار نہ کر سکا۔

وہ کہنے لگی ـــ "تم یہیں "نان کن" میں بیٹھ کر پیتے رہو۔ مجھے صرف دو گھنٹے کے لیے ضروری کام ہے۔ میں تم سے یہیں ملوں گی۔" اور اس نے میری جیب میں دس روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

پینا میری کمزوری سہی ـــ لیکن تاجی کے حوصلے اس قدر کیسے بڑھ گئے

آخر اس کا مجھ پر کیا حق ہے جو اس نے اس بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

لیکن میرے لب سل گئے تھے۔ میں اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں نے اسکے بھائی کو اس کی امانت پہنچا دی ہے۔ نہ ہی اس نے مجھ سے پوچھنا ضروری سمجھا۔
وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی پھر ریس کورس کی سمت چلی گئی۔ میں نے "نان کن" کے قریب پہنچ کر دیکھا! وہ دور کھڑی ہوئی کسی ٹیکسی میں سوار ہو رہی تھی۔

میں سمجھ گیا۔ پنکج نہیں آیا تھا۔ اس کا تو اپنا ذاتی موٹر ہے۔ پھر تاجی کس کے ساتھ گئی ہے۔؟

"نانکن" میں پہنچ کر میں نے وہسکی کا آرڈر دیا تو تاجی کے قدموں کی چاپ میرے دل میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں پیتا رہا اور تاجی میرے ذہن سے پھر محو ہو گئی۔ گھر بار بیوی بچے کچھ اس طرح میرے دل میں آکر بس گئے کہ اب تو وہاں کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میرا حال اب اس بھری ہوئی بس کا سا تھا۔ جس میں خود میرے لیے بھی جگہ نہ تھی۔ میں نے سوچا اب مجھے چل دینا چاہیئے۔ تاجی مجھے یہاں نہ پاکر واپس لوٹ جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے مزید پس و پیش نہیں کیا۔ بل ادا کیا اور نانکن سے باہر نکل آیا۔

تیز تیز قدم اٹھاتا میں ابھی بس اسٹینڈ تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک ٹیکسی تیزی سے آکر بالکل میرے پاس رکی۔ دروازہ کھلا تو تاجی مسکراتی ہوئی نکلی۔ وہ اکیلی تھی۔

"کہاں بھاگ رہے تھے تم ؟"

میرا دل جیسے دھڑک کر ٹھہر گیا۔ لیکن میں نے بات کو طول دینا نہ چاہا۔
"اب مجھے جانے دو تاجی ــــ میں اب اور نہیں رک سکوں گا۔"
اس نے رکنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے سہلایا۔
"میں سب کچھ جان گئی۔ مجھے سب کچھ بتلا دیا گیا ہے۔ میں نے اتنا وقت تمھارے مالک مکان کے ساتھ ہی گزارا ہے۔"
اور اس نے چپکے سے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے اپنا بند ہاتھ کھول کر دیکھا ــــ سو روپے کا نوٹ تھا۔ وہ لوٹ کر تیزی سے ٹیکسی میں سوار ہونے لگی تو میں نے لپک کر اس کو روکنا چاہا ــــ "تاجی! ــــ تاجی! یہ نہیں ہوگا تاجی! تم نے یہ پیسے اسی میرے ہاؤس اونر سے ــــ"
"تمھیں اس سے کیا ــــ جو نہ ہونا تھا ہو چکا ہے ــ اور ــ اور پھر ــ" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ــ "تمھارا مجھ سے رشتہ ہی کیا ہے؟"
وہ موٹر میں سوار ہو چکی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ اس کے قدموں میں پھینک دینا چاہا۔ لیکن وہ موٹر کے بند دروازے کا شیشہ چڑھا چکی تھی۔ موٹر بڑھنے لگا تو میں نے شیشے میں سے دیکھا تاجی نے اپنی ساری کا پلو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔
میں بیچ سڑک پر کھڑا سوچتا رہا۔ واقعی تاجی کا میرا رشتہ ہی کیا۔ بس اسی قدر نا کہ میں ہمیشہ اس سے مل کر اداس ہو جاتا ہوں۔

ــــ ــــ

مرے مول

سڑک نے جیسے اس کے قدم پکڑ لیے — مجھے پہچانو ورنہ آگے جانے نہ دوں گی۔!

وہ ٹھٹھک گیا — پھر کسی سوئی ہوئی یاد نے انگڑائی لے کر چٹکی لی۔

یہ تو وہی سڑک ہے جس پر میرا چھوٹا دادا اتارانگچے سے پیلی جوار گدھوں پر لاد کر لے آیا تھا کیونکہ ان دنوں ہمارے گاؤں میں قحط پڑ گیا تھا۔ میں بھی چھوٹے دادا کے ساتھ تھا۔ اس کی مدد کی تھی۔ اپنے سر پر ایک ننھی سی پوٹلی میں نے بھی اٹھا رکھی تھی۔

جتندرا نے اس سے کہا — تمھیں معلوم ہے اسی سڑک سے ناگپور کے مزدور اپنے ساتھ کئی سو گدھوں کا قافلہ لیے زمین کو ہموار کرنے کے لیے یہاں آئے

تھے۔ زمین کھودی جاتی تھی تو مٹی کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے وہ اپنے گدھوں سے کام لیتے تھے اور واقعی اس سنگلاخ زمین پر فیکٹری کی بنیاد رکھنے میں ان مزدوروں کا بڑا حصہ ہے۔

وہ کوئی چالیس سال بعد اپنے گاؤں کو لوٹا تھا۔

ماضی تو کسی مرحوم دوست کی مانند ہے کہ اس کی قبر پر پہنچو تو اپنی یادوں کو سمیٹ کر جیسے جاگ اٹھتا ہے۔

جب وہ شہر سے چلا تھا تو کتنے ہی چہرے اس کے ذہن میں ہیولیٰ بن کر بیدار ہوئے تھے۔ پھر ان کے خد و خال آہستہ آہستہ واضح ہوئے پھر وہ جیسے آنکھوں کے سامنے مجسم ہو گئے۔

چھینجا نیلو، بڑے حضرت دادا، کانسے اور سیسے کی گولیوں والا انجا، گلی ڈنڈے والا رحمان۔ ریڈی، بوٹ والا پاپیا، جس سے اس کی کشتی دیتی تھی، جوان اور خوبصورت لیکن بیوہ ماں اور پھر مچھلیوں سے بھرا گھنے سایوں سے ڈھکا چھوٹا سا تالاب، زندہ سید کی اونچی سی قبر۔

تم تو ابھی سے اپنے گاؤں والوں میں کھو گئے ہو۔

جتندر ا کہہ رہا تھا ــــــ یہی جذباتی لگاؤ جو تمھیں گاؤں والوں سے اور گاؤں والوں کو تم سے ہے یقیناً ہماری بات کو موثر بنا سکتا ہے۔

اور وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ اپنے گاؤں کے باسیوں کو آزادی کی نعمتیں اور برکتیں بتلانے چلا تھا۔

"من مول" کا سارا گاؤں رام چندرا پیڈم کے ہیوی الکٹریکلس پلانٹ

کے زیر اثر آرہا تھا۔ جو تیسرے منصوبے کے دوران میں جیکوسلواکیہ کے اشتراک سے تیار کیا جارہا تھا۔ ایک لاکھ ساڑھے بہتّر ہزار مربع میٹر کے رقبے پر اس کارخانے کی پوری عمارت مشتمل ہوگی اور فیکٹری کا پورا رقبہ ساڑھے گیارہ لاکھ مربع میٹر سے کچھ زیادہ یعنی تقریباً تین سو اٹھارہ ایکڑ ہوگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے ایک ایک فرد کے چہرے پر جگمگانے مستقبل کی کرنیں ناچتی دیکھے گا ـــــ انھیں بتلائے گا کہ ہمارا گاؤں، ہماری قومی خوشحالی کے بڑھانے کے لیے اپنے ہم وطنوں کے کام آرہا ہے۔ آندھرا پردیش کی صنعتی ترقی میں یہ پراجیکٹ جتنی اہمیت کا حامل رہے گا اتنی ہی اہمیت "من مول" کے ان نواسیوں کی رہے گی جنھوں نے اپنا گاؤں قوم اور وطن کے لیے خوشی خوشی دے دیا ہے۔ پراجیکٹ کی ابتدائی پلاننگ کے نقشوں میں "من مول" کا نام دیکھ کر آنے والی نسلیں سوچیں گی کہ یہ چھوٹے چھوٹے گھر جن کے صاف ستھرے آنگنوں میں نیم کے درخت ہوں گے، جن کی چھتوں پر پیپل کے سائے ہوں گے، جن کے رسوئی گھروں سے سورج کی پہلی کرن سے پہلے ہی دھواں اٹھنے لگا ہوگا جن کے ڈھور ڈنگر شام کو ہی لوٹ آتے ہوں گے جہاں گائیں کھونٹی سے بندھی اپنے بچھڑوں کو چاٹتی ہوں گی۔ جہاں نوجوان رادھائیں دیپ جلا کر کھیتوں سے لوٹتے ہوئے اپنے متوالوں کی منتظر رہتی ہوں گی۔ جہاں بوڑھی مائیں دعائیں دیتی ہوں گی اور شریر بچے ادھم مچاتے ہوں گے وہ "من مول" اب کیوں نہیں ہے ـــــ اس کے پاس جہاں کہیں انھیں رہنے کے لیے زمین مل سکی ہے منتشر ہو گئے ہیں اور یہ سب کچھ انھوں نے قومی خوش حالی کے لیے کیا ہے۔ یہ بلیدان

انھوں نے اپنے وطن کے لیے کیا ہے۔

اپنی تقریر کے لیے ذہن میں مواد جمع کرتا جب وہ سڑک پر پہنچا تو سڑک نے اس کے قدم پکڑ لیے ـــــ مجھے پہچانو ورنہ آگے جانے نہ دوں گی۔

اور جب اس نے سڑک کو پہچان لیا تو اس نے اپنے ساتھی جتندر سے کہا کہ "من موہن" میں ایک بار قحط پڑا تھا تو میں اور میرا چھوٹا دادا ایک دوسرے قریہ سے پیلی جوار گدھوں پر لاد کر لے آئے تھے تاکہ گاؤں بھر کی پریشانی عارضی طور پر بھی کوئی دوسرا انتظام ہونے تک دور ہو سکے۔ وہ سماں مجھے یاد ہے۔ رامو بولا ہے نے ہمیں گدھوں پر جوار لاتے ہوئے سب سے پہلے دیکھ لیا تو وہ بگٹٹ گاؤں میں بھاگا اور لوگوں میں یہ خبر جیسے سوکھی گھاس میں لگی آگ بن گئی۔ نیچے بالے ودو بڑے جو نقاہت سے نہ چل سکتے تھے وہ بھی اپنے بڑوں کی گودوں میں سوار ہوں توں سڑک تک چلے آئے۔ بوڑھیاں گھروں سے باہر نکل آئیں، جوان عورتیں چھتوں پر چڑھ گئیں کہ چھوٹے حقت کے جلو میں آگے بڑھتے ہوئے اس کاروان زندگی کو دیکھیں ـــــ جنا بیلو غلہ لا رہا ہے ـــــ دیکھو ـــــ وہ دیکھو۔

ہمارا گھرانا بڑا بیلو اور جنا بیلو کے نام سے مشہور تھا۔ لوگ اسے چھوٹے حقت اور بڑے حقت کا گھرانہ بھی کہتے تھے ـــــ ہم گاؤں میں پہنچ گئے تو زندہ سید کی قبر کے نیچے پیپل کی ننگی شاخوں کے اجلے سایوں میں پیلی جوار اس طرح تقسیم ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ کی طرح زندہ سید کے اونچے سے مزار پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اطمینان سے گھوڑے کی سواری کرنے لگا۔ کتنے ہی بڑے بوڑھے جو مجھے ایسا کرنے پر پھٹکارتے تھے اس سمے چپ ہو رہے، جوار لانے میں

میں کبھی چھوٹے دادا کے ساتھ جو تھا۔ میں نے اپنی اس برتری کو محسوس ہی کیا تھا کہ امام چچی نے للکارا —— "اترو روکیا اگلی اور محفلِ پھیلائے گا" —— میں زندہ سیّد کی قبر سے کود پڑا۔ لیکن میرا جی چاہا۔ امام چچی کو پیپل کی سب سے اونچی شاخ پر چڑھا دوں اور دیکھوں کہ کس طرح اترتی ہیں۔ یہ میری اپنی دانست میں سب سے کڑی سزا تھی۔"

وہ کہتا گیا —— مجھے یاد ہے۔ کھیل کھیل میں درخت کی کسی اونچی شاخ پر جب میں چڑھ جاتا تو مجھے یہ خیال بھی نہ ہوتا کہ اترتے وقت مجھ پر کیا بیتنے والی ہے اور جب اترنا چاہتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب پیر پھسلا اب ہاتھ چھوٹے، اب شاخ ٹوٹی اور میں زمین پر آرہوں گا۔ خوف کی بنیادیں اس احساس کے ساتھ ہی اندر ہی اندر گہری ہوتی چلی جاتیں اور میری بے بسی کا عالم دیدنی ہوتا —— اللہ میاں بے طرح یاد آتے اور میں دل ہی دل میں توبہ کرتا کہ کبھی اس قدر اس قدر بلندی پر نہیں چڑھوں گا۔ سوداخاں کے باغ سے نہ امرود چراؤں گا۔ نہ نارنگیاں۔ ماں نماز پڑھنا چاہے گی تو وضو کے لیے کنوئیں سے پانی خود نکال کر دوں گا اور اسے ستاؤں گا نہیں —— زندہ سیّد کی قبر پر کبھی نہیں چڑھوں گا اور قبلہ رو کھڑے ہو کر کبھی موتوں گا نہیں۔ شاخوں سے چھٹا ذرا سا نیچے آنے میں کامیاب ہوتا تو پھر حوصلے بڑھتے اور جب زمین پر پیر ٹک جاتے تو میں خود کو زمانے بھر کا فاتح محسوس کرتا۔ اس شاخ کو دیکھتا جس پر میں پہنچ گیا تھا تو وہ پہلے تو پہچانی نہ جاتی پھر ایسی اونچی نہ دکھائی دیتی اور اللہ میاں کی تو اب ضرورت ہی نہ رہتی اور وہ یاد بھی نہ آتے۔

جتندرا نے اس کو مخاطب کیا ___ گاؤں کے کسی آدمی کو ساتھ لے لو تاکہ وہ ہمیں لوگوں سے ملا سکے۔

اس نے جتندر کو روک دیا۔ میرے ذہن میں ایک چالیس سال پرانا شخص بیدار ہو گیا ہے۔ ہم ذرا اسی کی یاد کے سہارے گاؤں بھر کا چکر لگائیں ذرا دیکھیں یہ دس سال کا لڑکا ہمیں کہاں کہاں لیے پھرتا ہے۔

دیکھو ___ اس نے ٹھٹھک کر رکتے ہوئے کہا ___ جتندر یہ ہے زندہ سید کا مزار جس میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ سما گئے تھے۔ یعنی مرے نہیں ہیں۔ قبر میں زندہ اتر گئے ہیں تاکہ گاؤں والوں کے اعمال کا احتساب کریں اور وقتاً فوقتاً مصیبتوں سے نجات دلائیں۔ یہ اطراف جو اتنی بہت ساری قبریں ہیں وہ اس وقت نہیں تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بہت تاخیر سے پہنچا ہوں۔ پتہ نہیں کتنے ساتھی زندگی سے منہ موڑ چکے ہیں۔ کتنے بزرگ ان سے آگے نکل گئے۔

آؤ اب بائیں جانب گھوم کر سیدھے اس مسجد کے میناروں کی سمت چلتے ہیں میرا گھر وہیں کہیں تھا ___ سنا ہے اب ملبہ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ جس کا ہاتھ لگا اس نے اس سے استفادہ کیا ___ کچھ نشانیاں تو رہ گئی ہوں گی۔ نیم کا درخت جس کی شاخ جھکا کر بڑا دادا مسواک کے لیے ڈنٹھل توڑ لیا کرتا تھا یقیناً زندہ ہوگا ___ وہ کنواں تو ہو گا ہی جس کی گہرائی میں ڈول پھینک کر میری ماں ٹھنڈا میٹھا پانی اس تیزی سے نکال لیتی تھی۔ جیسے مرحوم ابا کی یادوں کی گھڑی اس کنوئیں میں گر پڑی تھی اور وہ جلد از جلد اس کنوئیں کو خالی کر دینا چاہتی تھی تاکہ اس گھڑی کو نکال سکے۔ لیکن چھوٹا دادا میری ماں کے ہاتھ تھام کر پانی

بندھنے میں اس کی مدد کرتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کنوئیں میں پا
اس کو لبالب بھر دینا چاہتا ہو تاکہ میری ماں مرحوم ابا کی یادوں کی
بھی نہ سکے ـــ میں ان باتوں کو سمجھنے لگا تھا۔ میں عمر کی اس منز
جہاں اپنی ماں کو اپنے چھوٹے دادا سے بات کرتا ہوا دیکھ کر میں سمجھ
کوئی بیوہ ماں اپنے مرحوم شوہر کے ہم عمر چچا سے بات نہیں کر رہی ہے
عورت ایک مرد سے بات کر رہی ہے ـــ ایک نظر ایک نظر سے بار
ہے اور ایسے میں میرے مرحوم ابا کی یادوں کی گٹھڑی ـــ کسی کنوئیں کی
گہرائی ہی میں کھل گئی تھی۔

چھوٹا دادا مصلحتاً میرا بہت خیال رکھنے لگا تھا ـــ ماں تو
تھی ـــ اس کی محبتوں پر مجھے کبھی شبہ نہیں ہوا۔ یہ احساس مجھے
ماں کبھی کبھی مجھ سے ڈرتی تھی۔

اوہ ـــ یہی میرا گھر ہوگا ـــ ذرا رک جاؤ ـــ بالکل یہی
سیلے درو دیوار کے اس گھر کو میں پہچان گیا ہوں ـــ وہ دیکھو نیم کھڑا
وہ اتنا بلند قامت ہوگیا ہے کہ کوئی بھی ہاتھ بڑھا کر اس کی شاخ
سکتا ـــ کنواں نہیں نہیں ہوگا جو جنگلی خودرو جھاڑیوں میں چھپ
یہ گھر تو جوں کا توں میری نگاہوں کے سامنے کھڑا ہے۔ بالکل اسی
طرح جیسے میں نے اس کو چھوڑا تھا۔ جیسے درو دیوار سانس لے رہے
وہ دیکھو میری ماں دیا جلا کر طاق میں رکھ رہی ہے ـــ وہ دیکھو
دادا کے کندھے پر میں شیر کا ناچ ناچ رہا ہوں اور میری ماں وہ ہر

ہنس رہی ہے۔
یہ مکان تو بابیا کا ہے ——— بابیا جولاہا ——— میرا گلی ڈنڈے کا ساتھی
——— اور ——— تم ——— تم تو بالکل ——— جی ——— جی میں بابیا کا بیٹا ہوں ———
اچھا ——— پھر کہاں ہے وہ ——— وہ کہاں ہے ——— مر گیا؟۔
ہوں ——— آؤ تمھیں سے گلے مل لیں۔
جتندرا نے زبان تک نہیں کھولی ——— اس نے اجنبی کو اپنے ساتھی کا نام تک نہیں بتایا۔ وہ ان اشاروں، کنایوں کی، آنکھوں کی زبان ہی سمجھتا رہ گیا ——— ہر بات میں اختصار بھی تفصیل بھی۔

"تو پھر چھوڑ رہے ہو گاؤں؟"

"ہاں"

"بہت اچھے، بہت اچھے ——— کہاں جا رہے ہو؟"

"ابھی کچھ طے نہیں ہے"

"عام طور سے لوگ کس طرح سوچ رہے ہیں"

"کچھ خوش نہیں ہیں ——— اپنی زمین چھوٹ رہی ہے۔ گھر بار چھوٹ رہا ہے"

وہ کہنے لگا ——— "ہمیں اپنے مستقبل کے لیے کچھ تو تحفا ہی ہوگا۔ میں یہی باتیں تو تم لوگوں سے کرنے آیا ہوں۔"

"چلو آگے چلتے ہیں" اس نے جتندرا کی بانہہ پکڑ کر کہا۔

"آؤ اس پیپل کے سائے میں بیٹھ کر اس کی ٹھنڈک کو محسوس کریں۔ یہ پیپل

بڑا پرانا ہے۔ کتنی ہی کہانیاں اس کے گھنے سایوں میں بنی ہیں۔ ہم تلنگی پڑھنے کے لیے جب اس مندر کی طرف جاتے تو اس ٹھنڈے گھنے سائے میں ذرا کی ذرا رک کر دم لینا ضروری تھا۔ سیسے اور کانسے کی گولیاں صرف لمحہ بھر کے لیے جیبوں سے نکال لی جاتیں۔ پھر یہ لمحہ پھیلتا جاتا تھا۔ کئی کئی منٹ گزر جاتے تھے۔ شاید کسی ہم جماعت نے پنچے پنتلو کو مندر کے چبوترے پر لے جا کر بتلا دیا کہ ہم کھیل رہے ہیں اور پنتلو وہیں سے پکارتا۔

"بیٹھ کھیا رہی ہے کہ سر کھیا رہا ہے؟"

اور ہم اپنی گولیاں ٹھونس کر جیبوں میں محفوظ کر لیتے اور یکبارگی دوڑ کر آگے پہنچ جاتے۔ درخت کے سائے سے مندر کے سایوں میں پہنچنے تک یہ بات قطعی ہو گئی ہوتی کہ سبق ختم ہونے پر اس لڑکے کی درگت بنائی جائے گی جس نے ہمیں کھیلتے ہوئے پکڑا دیا ہے۔

ایک بار لگان ادا نہ کرنے کے جرم میں پٹیل پٹواریوں نے بہت سارے کسانوں کو پکڑ لیا تھا اور یہاں چاندنی پر لے آئے تھے، جھلستی ہوئی گرمیاں تھیں، لو دیتا ہوا دن ـــــ نظام سرکار کا زمانہ تھا لیکن "ظل اللہ" کا کوئی سایہ کسی کسان کے سر پر نہ تھا بجائے اس کے تپتے ہوئے بڑے بڑے پتھر ان کے سروں پر دھرے گئے تھے۔ ہم دو تین ساتھی یہ ساری کارروائی اسی پیپل کی گھنی شاخوں میں چھپ کر دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد موٹی موٹی تنی ہوئی مونچھوں والے پٹیل سے ہمیں نفرت سی ہو گئی تھی اور ہم دل ہی دل میں اس سے ڈرنے لگے تھے۔

آؤ دا ہنے اور گھوم کر اس گلی سے چلیں تو شاید ہم مسجد کے پیچھے اڑے نکلتے ہیں ۔ ٹھیک ہے ــــ ہر چیز جوں کی توں ہے ۔ گاؤں والے بدل گئے ہیں میں بدل گیا ہوں ، لیکن گاؤں بالکل نہیں بدلا ۔ پیپل کے سائے سے جو مندر تمہیں نظر آ رہا تھا اس کا دروازہ یہ رہا ۔ اور پھر اسی میدان کا چکر کاٹ کر بائیں جانب مڑ جاؤ تو مسجد میں داخل ہو سکتے ہو ۔ مندر میں ہم " سرسوتی اوم نا تھ " پڑھتے اور مسجد میں گلستاں بوستاں ــــ جھنجا پنیتلی تنکو پڑھا تا تھا ۔ اور میرے بڑے دادا گلستاں بوستاں ــــ گاؤں کا کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو ان دونوں کا شاگرد نہ ہو اور جس کی ان دونوں کے ہاتھوں پٹائی نہیں ہوئی ہو ۔

وہ اونچی لال چھت دیکھ رہے ہو ۔ وہ یقیناً رحمٰن ریڈی کا بنگلہ ہوگا ۔ یہ بنگلہ ان دنوں نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو ایسا نہ تھا جو آج دکھائی دے رہا ہے ۔ رحمٰن ریڈی میرا گلی ڈنڈے کا ساتھی ہے ۔ سنا ہے میرے ساتھیوں میں صرف وہی ایک زندہ ہے ۔ چمبو کمار ، مجھو دھوبی اور بابا جولاہا یہ سب کے سب چل بسے ہیں ۔ اُن کی آل اولاد یقیناً ہوگی جو مجھے جانتی نہیں ۔

وہ گاؤں بھر میں گھومتا رہا ۔ ایک ایک چیز کو دیکھتا ۔ یادوں کو سمیٹتا ۔ ایک ایک چہرے کو تکتا ــــ مسجد کے پیچھے سخو بی بی کا مکان تھا جو پیش امام کی بیوی تھیں ، پیش امام کو مرے زمانہ ہو گیا تھا ۔ بڑھیا بھی اب کہاں باقی ہوگی ۔ اس کے قدم پھر بھی دروازہ کی طرف اٹھ گئے اور اس نے کنڈی کھٹکھٹا دی ۔ کوئی جواب نہ ملا ــــ اس نے زور سے پھر کھٹکھٹایا ۔

" کون ہے رے " ــــ آواز بوڑھی تھی ۔

"میں ہوں ماں"

"میں کون"؟ ــــ بوڑھی نے دروازہ کھولا تو وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا ــــ

"اچھا تو ہے ــــ تو بڑے حضرت کا پوتا ہے نا۔ مجھے بڑا انتظار تھا، تیرا ــــ"

"ہاں ماں میں آگیا ہوں"

"کیوں آیا ہے ــــ ابھی کچھ دن اور نہ آتا ــــ اور پھر کیا لے آیا ہے رے ہمارے لیے۔ یہی خوش خبری نا کہ گاؤں چھوڑ دو ــــ اس لیے چھوڑ دو کہ تیرا ملک ترقی کر رہا ہے ــــ ہم اپنا گھر بار چھوڑ دیں۔ کھیت کھلیان چھوڑ دیں۔ مسجد کے کنوئیں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی چھوڑ دیں جو ہلک کی رگوں میں خون بن گیا ہے۔ یہاں کے سائے چھوڑ دیں، یہاں کی دھوپ چھوڑ دیں، اس مندر کو چھوڑ دیں جہاں تو نے اد نامہ پڑھا تھا۔ اس مسجد کو چھوڑ دیں جہاں تجھے تیرے دادا نے گلستاں بوستاں پڑھائی اور تب کہیں جا کر تو نے شہر میں بڑی بڑی ڈگریاں لیں ــــ تو تو بھول بیٹھا ہے ــــ تجھے تو یہ بھی یاد نہ ہوگا کہ جب تو چھوٹا سا تھا تو ہیضہ میں اللہ کو پیارا ہو گیا ہوتا اگر میرا مولوی تجھے پناہ بچاتا۔ کیسا بے کل تھا وہ۔ رات بھر پلک نہ جھپکی اس کی۔ دن بھر زمین سے بیٹھ نہ لگی۔ منٹ منٹ پہ دم کر کے تجھے پانی پلاتا۔ تب کہیں تو نے آنکھیں کھولیں ــــ جب کچھ ہاتھ پاؤں نکالے تو شہر کا ہو رہا۔ پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ اور آج چالیس سال بعد تو گاؤں والوں کو سبق

پڑھانے آیا ہے کہ خوشی خوشی گاؤں چھوڑ دو ــــ مجھ سے یہ کہنے آیا ہے کہ میری ہڈیاں اب میرے مولوی کے برابر دفن بھی نہ ہوں گی ــــ ارے میں نے تو اپنی قبر تک کھدوالی ہے ــــ اپنے نام کا کتبہ تک لگوا لیا ہے ۔ صرف میری موت کی تاریخ کھودنی رہ گئی ہے ۔ سو یہ کام تو کر دینا ــــ بہت دور سے چل کر آیا ہے تو ۔"

وہ کہتی گئی ــــ "میں نے اپنے ایک ایک بچّے سے کہہ دیا ہے کہ گاؤں خالی نہیں ہوگا ۔ سرکار بنوا لے اپنی فیکٹری ہماری لاشوں پر ۔ جب تک ہماری آنکھوں میں بینائی ہے میرے گاؤں کا کوئی بچّہ من مول کی ایک کٹیا کو بھی زمین پر آتے ہوئے نہیں دیکھے گا ۔ گھر تو گھر ہیں ــــ تجھے پتہ ہے جب کبھی کوئی گھر ڈھے جاتا ہے تو آدمی اس کا ملبہ عمر بھر اپنے سینے میں اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے لیکن گھر نہیں بنتا ۔

"سنتی ہوں تیری سرکار معاوضہ دے گی ــــ بھلا بتا تا تو ان ہواؤں کا معاوضہ کیا ہوگا جو نفتوں سے جسم میں اتر کر روح بن گئی ہیں ــــ

"تو نے گاؤں کی ہر ریت بھلا دی ہے ۔

"تجھے تو اب تک یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ چالیس سال کے بعد تو نے اپنے گاؤں کی دھرتی پر قدم رکھا ہے ۔ لیکن تیرا کوئی ساتھی، تیرا کوئی یار، تیرا کوئی دوست تیرے سواگت کو گاؤں کی سرحد تک بھی نہ آیا ــــ ویسے تیرے آنے کی خبر سب کو ہے ۔ یہ کوئی اچھی علامت ہے رے اور تو دیوانوں کی طرح گاؤں میں اکیلا اکیلا پھر رہا ہے ۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے ۔ تیرے آنے کی میرے

بچّوں کے دلوں میں خوشی بھی نہیں — آخر کیوں ۔ بچھڑا ہوا بھائی اپنے گھر آیا ہے تو کوئی بڑھ کر گلے لگانے والا نہیں — یہ من مول" یہ گاؤں یہ تو ایک خاندان ہے ۔ یہ تو ایک گھرانا ہے اور تو بھی اسی خاندان، اسی گھرانے کا بیٹا ہے "

" اور تم اس گھرانے کی ماں ہو — اس خاندان کی ماں ہو ۔ سارے من مول کی ماں ہو — ہو نا ؟ " —

" ہاں ہوں — بالکل ہوں "

" کیوں نہیں ہوں — کیوں نہیں ہوں — مگر تو "

" مگر تم نے میری بات سُنی ہی کہاں "

" میں تو اپنی ماں کے لیے اس کی ماں کا پیام لایا تھا — میں تو اپنے " من مول " کے لیے ہندوستان بھر کی دھرتی کا سلام لایا تھا ۔

" میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ کوئی سرکار ہم سے ہمارا " من مول " لے نہیں رہی ہے ۔ ماں — لیکن ہم خود اپنے وطن کو اپنا " من مول " دے رہے ہیں، ہم اپنے مستقبل کو اپنا حال دے رہے ہیں ۔ اپنے کل کو اپنا آج دے رہے ہیں ۔ تم مان جاؤ ماں ۔ تم مان جاؤ گی تو سارا گاؤں مان جائے گا ۔ آنے والی نسلیں ہمیں یاد رکھیں گی ماں — جب الکٹریکل پلانٹ مکمل ہو جائے گا ماں تو خوش حالی بڑھے گی ۔ تیرے ہی بچے بالے سکھ اور آنند کی زندگی گزاریں گے ۔ کتنے ہی لوگوں کو کام مل رہا ہے تو ذرا سوچ تو ماں غفور رے نے ابھی بتایا تھا کہ وہ اور اس کے دونوں بھائی پلانٹ ایریا کے اطراف بنتے ہوئے پارکوں اور عمارتوں

یں مستری کا کام کر رہے ہیں۔ اور انھیں یومیہ ساڑھے تین روپے مل رہے ہیں۔ اس طرح تیرے گھر یومیہ ساڑھے دس روپے آجاتے ہیں اور تو پھر بھی خوش نہیں ہے "

" بہت خوش ہوں ۔ بہت خوش ہوں ۔ یہ چار دن کے ساڑھے دس روپیوں نے تجھے خبر ہے مجھ سے کیا کیا چھین لیا ہے ۔۔ ان روپیوں نے کھلیانوں کا سونا چھین لیا۔ ان روپیوں نے تجھے خبر ہے وہ کوکھ چھین کی جس سے ننھّی ننھّی کونپلیں پھوٹتی تھیں ۔۔ ان روپیوں نے میرے بچّوں کا وہ پسینہ چھین لیا جن کی کھاری کھاری سوندھی جوار کے خوشے لہلہاتے تھے ۔۔ ان روپیوں نے بیلوں کی گھنٹیوں کی وہ میٹھی آوازیں چھین لی ہیں جنھیں سُن کر تو بیدار ہوتا تھا اور آج ان آوازوں کے سُر مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے نیچے دب گئے ہیں ۔۔ اور ایسے میں تو مجھے عقل سکھانے آیا ہے موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر مجھے جتانے آیا ہے کہ بال دھوپ میں پکتے ہیں ۔۔ میں کہوں۔ میں کہوں ۔۔ کوئی کتاب ۔کسی سفید بال سے زیادہ نہیں ہوتی "

اس نے بہ غور جتندر کو دیکھا ۔۔ پھر کچھ اس طرح کہنے لگا ۔جیسے خود اپنی کھوئی ہوئی آواز کو ڈھونڈ رہا ہو ۔

" ماں کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے ۔کل تو جب سرکار نے مجھے جیل میں بند کیا تھا اور تو نے فخر سے کہا تھا کہ اپنے وطن کی بھلائی کے لیے لڑنے والا دینا تو ہمارے گاؤں کا بیٹا ہے ۔۔ کل تو جب اپنے بیٹے کو جیل میں دیکھ کر فخر کر سکتی تھی ماں تو آج اپنا گھر اپنے دیس کے لیے چھوڑتے ہوئے بھی تجھے

پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔

یہ گاؤں مجھے بھی اتنا ہی پیارا ہے ماں! — مجھے بھی یہاں کی ایک ایک چیز سے محبت ہے۔ ایک ایک چہرہ میری یادوں میں بسا ہوا محفوظ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے اپنے "من مول" کی دھرتی پیاری نہیں ہے۔ میرے گھر کے کھنڈر بھی یہیں ہیں۔ میرے باپ دادے بھی یہیں دفن ہیں، لیکن ہم جس کے لیے یہ سب چھوڑ رہے ہیں۔ وہ دیس بھی تو ہمارا ہے "

اپنے گھر میں اپنا کمرہ سب کو پیارا ہوتا ہے — اپنے گاؤں میں اپنا گھر سب کو پیارا ہوتا ہے۔ اپنے شہر میں اپنا گاؤں سب کو پیارا ہوتا ہے۔ اپنے صوبے میں اپنا شہر سب کو پیارا ہوتا ہے۔ محبت اور پیار کا یہ تصوّر اسی طرح وسیع تر ہوتا جاتا ہے ماں — اور جب سارا دیس کسی کو پیارا ہو جاتا ہے تو ساری تفریق مٹ جاتی ہے۔ جب سارے دیس کی دھوپ چھاؤں اپنی ہو جائے تو "من مول" بہت وسیع ہو جاتا ہے اس کا پیار بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کی حدیں دیس بھر میں پھیل جاتی ہیں "

بوڑھی ماں نے نظریں اٹھا کر دور دور تک دیکھا جیسے "من مول" کے حدود سے آگے دیس بھر کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو — وہ ہری ہو کر وہ اپنی چٹائی سے اٹھی — اس نے کہا مجھے نقارہ کے میدان تک لے چل میں خود اپنے ہاتھوں سے نقارہ پیٹ کر منادی کروں گی اور اپنے بچوں کو جمع کر کے کہوں گی کہ وہ اپنے وینا کو پہچانیں جو سارے ملک کا سلام "من مول" کے لیے لایا ہے۔ نقارے پر چوٹ پڑی اور اس کی آوازیں فضاؤں میں بلند ہو کر پراجکٹ کی مشینوں

کی آوازوں سے جیسے بغل گیر ہو گئیں اور "من موہن" اٹھ کر رام چندر اپورم کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن جب بوڑھی ماں نے نقارے کی آواز پر داہنی طرف آتے ہوئے اپنے بچّوں کو دیکھا تو اس کے ہاتھ مضمحل ہوتے گئے اور اس سے پہلے کہ اپنے بچّوں کو وہ کچھ کہتی اس نے تھکی تھکی نظروں سے سب کو دیکھا اور زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کے بچے اس کو ہوش میں لانے کے لیے اس کی طرف دوڑ پڑے اور ان دوڑنے والوں میں دینا بھی تھا۔

رابی اپیا

جب وہ پیٹ میں پڑی تھی تو رابی اپیا کے پیٹ میں سوائے اُس کے جیسے کچھ رہ ہی نہ سکتا تھا۔ نہ پانی کی بوند، نہ سنگترہ کی پھانک کا رس، نہ چمچہ بھر بادام کا حریرہ۔ برف کے ٹکڑے مانوان کی غذا بن گئے تھے۔ اس طرح اپنا آپا تج کر اسے اپنے بطن سے جنم دیا۔ اُسے اپنی چھاتیاں چوا کر دودھ اس طرح پلایا کہ لہو کی بوندیں بھی ساتھ پلانی پڑیں۔

پھر جب وہ دنیا میں آئی تو کتنی راتوں کی نیند، کتنے دنوں کا چین رابی اپیا نے اپنے پر حرام کر لیا۔ تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوئی کہ دو قدم چل پھر لیتی۔ ورنہ وہ کون ایسی صحت مند تھی جو رابی اپیا کی آغوش میں ایک ہمکتی سی جان، کلکاریاں لگاتی ہوئی علانیہ محسوس ہوتی اور آنے جانے والے اس نئی زندگی کی طرف توجہ دیتے۔

لیکن آج جبکہ اس نے اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ آج جبکہ وہ پٹ پٹ باتیں کر سکتی تھی اس نے ماں کو سبھوں کی طرح رابی اپیا بھی تو نہ پکارا۔

اور رابی اپیا سب کچھ شن کر اگر کچھ سیکھ سکیں تو پاگلوں کی طرح مسکرانا۔ ایسی مسکراہٹ جو اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کا احساس چھپانے کے لیے ہونٹوں تک لائی جاتی ہے۔ اور اگر وہ ہونٹوں سے چپک کر ہی رہ جائے تو زندگی کیسی لٹ کر رہ جاتی ہو۔ رابی اپیا ٹین کا ایک ایسا خالی ڈبہ تھیں جس کو ذرا سے ہٹو کے پر ٹن سے بول اٹھنا چاہیے۔ لیکن یہ خالی ڈبہ لبالب بھرے ہوئے ڈبوں کی طرح خاموش تھا۔ اب اس خالی خولی خاموشی کے سہارے تپ دق کو نس نس میں سمائے وہ زندگی کے سفر پر چل پڑیں۔

رنگ روپ آہستہ آہستہ اس طرح غائب ہوا جیسے کٹے ہوئے سُرخ سُرخ سیب کے گودے کی سفیدی ہوا کھا کر غائب ہوتی ہے اور رابی اپیا ہوا نہیں دھوپ کھا رہی تھیں۔ دھوپ بھی کیسی دھوپ جس کی چمک تو دکھائی نہ دیتی تھی مگر حرارت بدن کا حصّہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس حرارت میں سب رنگ روپ پگھل گیا۔ اس حرارت میں سب لطیف احساس پگھل گیا ـــــ اور رابی اپیا ایک ایسی مسکراہٹ کو پکڑ کر رہ گئیں جس کا ناتا رشتہ آنسوؤں سے جا ملتا ہے۔ میں نے تو اس مسکراہٹ میں ہمیشہ آنسو ہی دیکھے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہہ دوں کہ سبھوں نے اس مسکراہٹ میں یہی کچھ دیکھا۔ سارے گھر نے ـــــ اور سب ہی نے آنکھیں پھیر لیں یہ بھی برا نہ تھا۔ رابی اپیا کہاں ہر ایک نظر کو ٹٹولتی پھر رہی تھیں کہ کس میں کتنا پیار ہے؟ ان کو ہر بات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جان چکی تھیں کہ

ان کے فرائض کیا ہیں۔ اپنے وجود کو گھر بھر سے اس طرح الگ کر لو کہ تمھارا سایہ کم ہی کسی پر پڑے۔ رانی تم ماں ہو، تم بیوی ہو، تم بہن ہو۔
سو رانی نے خود کو بھرے گھر میں تنہا تنہا محسوس کیا۔
حارث بھائی، اپیا کی تپتی ہوئی زندگی پر نیم کا گھنا سایہ بنے ٹھنڈک پہنچانے کے لیے ڈولتے رہے۔ لیکن جلد ہی جب اس نیم کے ساتے کو اس بات کا یقین سا ہو چلا کہ اپیا کا تپ دق ٹھنڈے سایوں پر بھی آگ پھینک دے گا تو ڈوبتے ہوئے سورج کے ساتھ ساتھ سائے دیوار پر چڑھنے لگے۔ حارث بھائی اپیا کی زندگی سے کچھ اس طرح بوکھلا کر نکلے کہ اپیا کی ہمدردی میں جھوٹ موٹ کی اداکاری بھی وہ کامیابی سے نہ کر سکے۔ اور دو ہی جست میں انھوں نے چوکی نشین ہو کر مصلّیٰ سنبھال لیا اور لگے وظائف پڑھنے اور تسبیح پھیرنے۔
اتنے بڑے سے گھر میں اب چار روحیں ایک دوسرے سے بیگانہ بیگانہ سی پھرنے لگیں۔ پھر تین روحوں نے آہستہ آہستہ سر جوڑ لیا ــــــ اور رانی اپیا نے آنکھیں کھول کھول کر سب کو دیکھا، سب کو سمجھا اور اب صرف وہی اکیلی رہ گئیں ـــــ

رانی اپیا پہلے ماں تھیں، ویسے حارث بھائی کو بھی انھوں نے کب ٹوٹ کر نہ چاہا۔ لیکن حارث بھائی تو دیوانے تھے۔ حفظ ما تقدم کے طور پر انھوں نے جا نماز کی جیسے چادر تان لی تھی۔ پانچ منٹ نماز پڑھتے، پھر وظائف پڑھتے اور گھر میں جب تک رہتے تسبیح ہاتھ میں رہتی اور یوں اپنی دنیاوی خواہشوں کو بے چاروں نے جا نماز کے نیچے چھپا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اور رانی اپیا

نے بھی خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ مجھ نصیبوں جلی نے جو کچھ محبت حارث کو دی ہے، جو کچھ سکون اسے بخشا ہے، جو کچھ تسکین اسے پہنچائی ہے اس کی عمر اس قدر قلیل تھی کہ اس نے مجھ سے جدا ہو کر اپنی بھری جوانی میں جانا نہ اوڑھ لی تھی۔ حارث بھائی کی زندگی کی اس طہارت پر رانی اپیا کبھی جی ہی جی میں خوش ہوتیں۔ کبھی ان کا جی مسوس کر رہ جاتا۔ کبھی اپنی دل گرفتہ ہو جاتیں کہ ان کے بس میں ہوتا تو ٹوٹ ٹوٹ کر حارث بھائی کی تسکین کا باعث بنتیں ۔۔۔۔ رہ گئی لاڈلی سو وہ کچھ دن بے کل بے کل سی گلی گلی پھرتی رہی۔ جب کبھی رانی اپیا کے قریب آنا چاہا انھوں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کو روک دیا ۔۔۔ خدارا میری جان ۔۔۔ خدارا میری بچی ۔۔۔ مجھ سے نہ لپٹو ۔۔۔ اللہ تیرا محافظ ہے۔
اس طرح لاڈلی کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کتنی ہی بار رانی اپیا نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے وہ اپنی روح کو اپنے تن سے جدا کر رہی ہیں۔ امڈ امڈ کر پلکوں تک آتے ہوئے آنسوؤں کو انھوں نے پلکیں جھپک جھپک کر اس لیے روکا کہ لاڈلی پوچھ نہ لے کہ امی تم رو رہی ہو۔ لیکن لاڈلی جب رانی اپیا سے دور ہوتی گئی تو آہستہ آہستہ اس نے اپنی خالہ امی کا سہارا لیا ۔۔۔ اس آغوش میں بھی لاڈلی کو بڑا سکون ملا۔ خالہ امی کی گردن میں باہیں ڈال کر وہ جھول جھول جاتی۔ خالہ نے بھی اپنی کنواری ممتا اسے بخش دی۔ لاڈلی ویسے بھی اس کی چہیتی تو تھی ہی۔ لیکن سوکھے ہوئے زرد پتے کی طرح جب وہ رانی اپیا کی مرجھاتی ہوئی شاخ سے ٹوٹ کر ادھر ادھر ہواؤں میں ڈول رہی تھی، چھوٹی آپی نے اسے سنبھال کر رکھ لیا۔

بھائیں بھائیں کرتے گھر میں کوئی اور ننھا منا تو تھا نہیں۔ جو لاڈلی کسی سے کھیلتی، لڑتی، ہنستی، روتی، رلاتی ـــــ جب بھی تنہائی کے احساس سے اس کا جی اوب جاتا، جب بھی سناٹے اس کے چھوٹے سے ذہن میں سائیں سائیں کرتے اور اکیلاپن ہراس بن کر دل پر چھانے لگتا۔ وہ یکلخت ماں کی طرف بھاگتی۔ کیونکہ حارث بھائی دفتر چلے گئے ہوتے اور چھوٹی آپی بے چاری بھنڈار سے گھر کے کام میں جٹ جاتی۔

رابی اپیا اس کو بے تحاشا اپنی طرف دوڑتا ہوا دیکھتیں تو دور ہی سے دونوں ہاتھ بڑھا کر پکار اٹھتیں ـــــ خدارا میری جان ـــــ خدارا میری بچی ـــــ اور لاڈلی ٹھٹک کر اس طرح کھڑی رہ جاتی کہ تنہائی سے اکتا کر جس سمت وہ بھاگ رہی تھی اُدھر صرف تنہائی ہی نہیں بھیانک اندھیرا بھی ہے۔

اور اس پھیلتے ہوئے اندھیرے نے آہستہ آہستہ ایک خوف سا لاڈلی کے ذہن پر ہمیشہ کے لیے مسلط کر دیا۔ اب کبھی لاڈلی کا جی بھر آتا تو وہ خالہ امی پکارتی پھرتی۔ اور چھوٹی آپی کے کانوں میں اس کی آواز کا رس ٹپکتا تو وہ بھی اس پر نچھاور ہو ہو جاتی۔

رابی اپیا چھوٹی آپی کے دل میں لاڈلی کے لیے جب اتنی جگہ دیکھتیں تو اُن کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتیں۔ رابی اپیا جان چکی تھیں کہ دلاسوں اور تسلیوں سے اب اُن کی جلتی ہوئی روح کوئی تسکین نہیں پا سکے گا۔ وہ جسم جو اپنا رنگ روپ تج کر ایسی تصویر کی طرح ہو جائے جو دھوپ

کھا کھا کر ذرہ بکھر گئی ہو تو پھر سارا وجود تصویر ہی بن کر رہ جاتا ہے اور رابی اپیا بس ایک چلتی پھرتی مری مری سی تصویر بن کر رہ گئی تھیں ــــ اس تصویر کے ہونٹوں پر البتہ ایک ایسی زخمی مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی جیسے کسی تصویر کو چھپانے کے لیے بھک سفید کاغذ چپاں کر دیا گیا ہو ــــ اور یہ بھک سفید کاغذ دیکھنے والوں کو کتنا اکھرتا ہے۔ رابی اپیا کہاں اس بڑے سے گھر کا اجالا بنی ہوئی تھیں ــــ کہاں، اب ہر گوشے اور ہر اندھیرے کے ساتھ ان کا تصور ابھرتا تھا۔

لاڈلی تو ہراساں بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ اب نہ وہ رابی اپیا کی طرف توجہ ہی کرتی نہ ان کی توجہ کی طالب ہوتی۔ اس کے چھوٹے سے ذہن نے اس بات کو قبول کر لیا تھا کہ رابی اپیا کوڑے کرکٹ کا ایک ایسا ڈھیر ہیں جس کو چھونے سے کچھ الجھن سی ہوتی ہے۔ رابی اپیا سے جب وہ اس طرح دور ہو گئی تو ان کی ممتا نے آہستہ آہستہ سسکنا سیکھ لیا۔ لاڈلی دن دن بھر رابی اپیا کے کمرے کا رُخ ہی نہ کرتی۔ اور وہ گھر ہی میں رہ کر بھی اس کی صورت کو ترس کر رہ جاتیں۔ کبھی ممتا کے پرسکون سمندر میں ایسی موجیں اٹھتیں جنھیں رابی اپیا خود بھی نہ دیکھ پاتیں۔ صرف محسوس کر سکتیں تو وہ چپکے سے دالان میں چلی آتیں۔ دور کھڑی لاڈلی کو اپنی پیار بھری نظروں سے دیکھتیں جیسے چوم رہی ہوں۔ پھر کچھ بات ہی کو لینے کے لیے اسے پکار کر چھیڑتیں تو وہ نظر اٹھائے بغیر اسی تڑاخ سے کچھ اوٹ پٹانگ سا جواب دے دیتی اور رابی اپیا کی زخمی مسکراہٹ اپنی بے بسی کو چھپانے کے لیے ان کے خشک ہونٹوں پر پھیل جاتی۔

ان ہونٹوں پر جن پر پپڑیاں بن گئی ہوں، مسکراہٹ چاند کی کرن تو بن نہیں سکتی، سوئی کی نوک بن جاتی ہے، اور اپنے ہونٹوں پر سوئی کی اس نوک کو رانی اپیا علانیہ محسوس کر لیتیں۔ چھوٹی آپی یہ منظر دیکھ کر اس طرح انجان بن جاتی جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

حارث بھائی کا مصلّی تو تخت پر بس بچھا کا بچھا ہی رہتا۔۔۔ ایک کونہ موڑ کر وہ اٹھ کھڑے ہوتے اور اس طرح گویا عبادت کے اختتام کا اعلان ہو جاتا۔ پھر دفتر جانے کی تیاریوں میں اس طرح لگ جاتے کہ بات کرنے کی بھی جیسے فرصت نہ ہو۔

رانی اپیا جب سے پڑ گئی تھیں چھوٹی آپی کے سر پر اتنا کام آپڑا تھا کہ اُسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی۔۔۔ پتہ نہیں صبح شام بال سنوار لینے، آنکھوں میں کاجل پھیر لینے اور چہرے پر الٹا سیدھا پوڈر مل لینے کے لیے وہ کس طرح وقت نکال لیتی تھی۔

ہر شخص مصروف ہو گیا تھا۔۔۔ ہر چیز جہاں کی تہاں تھی۔ زندگی کے قدم جو رانی اپیا کی بیماری کے اعلان کے بعد کچھ اکھڑ اکھڑ سے گئے تھے اب پھر ٹھیک ٹھیک پڑنے لگے تھے۔ وہ ناؤ جو ڈگمگا گئی تھی۔ اب دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔

جب سنبھول کا چھپا ہوا سکون سنبھول کو واپس مل گیا تو رانی اپیا سمجھ بیٹھیں کہ حارث بھائی اور چھوٹی آپی نے ان کی بیماری سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور اب وہ تن تنہا مقابلہ کرنے کے لیے رہ گئی ہیں۔ اب رانی آپا اوس کا وہ قطرہ تھیں جو پھول

کی پنکھڑی پر نہیں سوئی کی نوک پر ٹھہرا ہوا کھڑی دوپہر کا منتظر تھا کہ سورج سر پہ چمکے اور تحلیل ہو کر اس اذیت سے چھٹکارا پائے جس کا نام زندگی ہے۔

حارث بھائی نے رابی اپیا کے علاج معالجے میں پہلے پہلے تو کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جتنا بن پڑتا کرتے۔ بساط سے زیادہ ہی انھوں نے کیا اور اب بھی مقدور بھر کر رہے تھے۔ لیکن رابی اپیا کا دکھ درد علاج کے سوا اور بھی تو کچھ چاہتا تھا۔ اور یہ چاہت سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ حارث بھائی، چھوٹی آپی اور لاڈلی سب مل جل کر ان سے ان کی تنہائی کا احساس چھین لیں۔ لیکن اب یہ مشکل تھا۔

لاڈلی کے دل میں آہستہ آہستہ پتہ نہیں کیسے کیسے جذبوں نے سر اٹھایا کہ وہ سرے سے رابی اپیا سے بغاوت کر بیٹھتی۔ اس کی اس باغیانہ روش پر نہ کوئی ٹوکنے والا تھا نہ کوئی سمجھانے والا ــــ وہ جان گئی تھی کہ رابی اپیا گھر کا وہ بے مصرف کمرہ ہیں جو گھر میں داخل ہوتے ہی مقفل کر دیا گیا ــــ ایسا درخت جو پھل پھول ہی دے سکے نہ ٹھنڈا سایہ۔ گھر میں اُگے تو کیا، جنگل میں اُگے تو کیا۔ بس لاڈلی تو رابی اپیا کو کچھ ایسا ہی درخت سمجھنے لگی تھی۔ اس کے لیے تو جو کچھ تھیں چھوٹی آپی تھیں۔

"خالہ امی بھوک لگی ہے۔"

"خالہ امی کپڑے بدل دو۔"

"خالہ امی آج اسکول میں نہیں جانے کی۔"

"خالہ امی چاکو بار کھلا دو۔"

رانی اپیا نے سوچا، معبود میرے۔ تیرے ان گنت احسانوں میں یہ بھی ایک ہے کہ لاڈلی کو اس کی خالہ امی سے مانوس کر دیا۔ ورنہ وہ ماں کی محبت کے لیے ترس ترس جاتی۔

اب رانی اپیا سرتاپا صبر و شکر بن کر رہ گئی تھیں۔ لاڈلی تو بھول بھال گئی تھی کہ رانی اپیا اس کی ماں ہیں۔ وقت پڑنے پر وہ کبھی انھیں امی پکارلیتی تو رانی اپیا جیسے سوتے میں چونک پڑتیں ورنہ وہ تو اب رانی اپیا کو خاطر ہی میں نہیں لاتی تھی۔

لاڈلی کے اس رویّے کو حارث بھائی اور چھوٹی آپا نے اپنی یک سخت خاموشی سے جیسے جائز قرار دے دیا تو رانی اپیا کو یقین ہوگیا کہ وہ اپنا سماجی موقف بھی اسی گھر میں کھو رہی ہے۔ وہ جس کے اشارے پر گھر کی کایا پلٹ ہو جاتی تھی؛ اب ہر ایک کے رحم و کرم کا منتظر تھا۔ بس کوئی شے اس کے اپنے بس میں تھی تو وہ زخمی مسکراہٹ تھی جو سوکھے ہونٹوں پر یوں معلوم ہوتی جیسے ترخی ہوئی زمین پر پیلی پیلی دھوپ کا سماں ـــــ اور اس مسکراہٹ کو رانی اپیا نے کچھ اتنی مجبوری سے اپنے ہونٹوں پر ضرورتاً بکھیر لینے کا اہتمام کر رکھا تھا کہ انھیں مسکراتا ہوا دیکھ کر وحشت سی ہوتی تھی جیسے کوئی سچائی کا منھ بند کر کے چیخ چیخ کر جھوٹ کہہ رہا ہو۔

معبود میرے ـــــ کتنی ہی بار تو وہ مسکراتے وقت وہ پاگل سی لگتی ہیں۔

واقعی رانی اپیا کو دق کے بجائے کوئی دماغی مرض لاحق ہوتا تو شاید ان کے لیے بہتر ہی ہوتا۔ آدمی کا ذہن ماؤف ہو جائے تو اپنی سوچوں کے زہر سے

تو وہ محفوظ ہو جاتا ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے رابی اپیا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔ کسی کا بے سہارا ہو جانا اُسے بڑا طاقت ور بھی تو بنا دیتا ہے۔ ہوا کے جھونکوں سے جلتے ہوئے چراغ کی لَو کو بچانے کے لیے کوئی ہاتھ حفاظت ہی نہ کر سکے تو سمجھ لو دیا جلے یا بجھے، فرق کوئی پڑنے والا نہیں ہے ــــ رابی اپیا یہ سب کچھ جان گئی تھیں۔ اسی لیے تو اب یوں بھی ہونے لگا تھا کہ سینے کے درد کو ہاتھوں سے دبائے وہ چپکے سے کسی رات کو خون تھوک آتیں تو صبح ہونے پر بھی سونے والوں کو پتا نہ چلتا ــــ

زندگی ہمیشہ زندگی کا ساتھ دیتی ہے۔ موت کا وہ کبھی ساتھ نہیں دیتی ان دونوں میں اللہ واسطے کا بیر ہے۔ دو قدم ساتھ چلتے ہیں تو کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کا گلا دبوچ لیتا ہے۔ اور یہ فتح و شکست جتنی کم مدت طے پا سکے اتنا ہی آدمی کے لیے اچھا ہے۔ لیکن رابی اپیا کی زندگی اور موت نے جیسے آپس میں کچھ سازش کر لی تھی ــــ نہ یہ اُس پر وار کرتی تھی نہ وہ اس پر ــــ دونوں سر جھکائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے خائف تھے۔ پتا نہیں کون کب جُل دے جائے۔ اور رابی اپیا خون تھوک تھوک کر پاگلوں کی طرح مسکرا رہی تھی۔

آج سویرے سویرے ہی رابی اپیا بڑے کرب میں مبتلا تھی۔ اس کو کیا ہو رہا تھا یہ تو کہنا مشکل ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں کچھ اس طرح جاگ رہی تھیں، جیسے بس اب سو جانے والی ہوں۔ آج صبح صبح اس کے ہونٹوں پر اس کی وہ

مخصوص مسکراہٹ بھی نہیں تھی جس سے وہ پاگل ہی نظر آتی ۔ اور جی چاہتا کہ دانی ایسا کچھ تو نظر آئے ۔

اس وقت ـــــ اس وقت اگر میں تمھیں کچھ دے سکتا رانی ایسا ـــــ تو موت دے دیتا ـــــ اور تم جانتی ہو کہ تمھارے لیے اس سے زیادہ خوبصورت کوئی تحفہ نہیں ہے، لیکن ہم سب بندے لاچار ہیں ۔ مجبور ہیں ۔ کسی کو موت بھی تو نہیں دے سکتے ۔

لیکن تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ تمھاری موت نے تمھیں جکڑ کے اپنے شکنجے میں لے لیا ہے اور تمھارا یہ سوتا جاگتا چہرہ کیا اسی اطمینان کا باعث تو نہیں ہے ۔

دراصل ہوا یوں کہ رانی ایسا کے رات سینے میں درد اٹھا ۔ وہ اپنے سینے کو دبا کر سنبھلی تو اس کا منہ خون سے بھر گیا اور پلنگ کے پاس پیک دان نہ پاکر وہ قریبی راستے سے صحن کی طرف لپکی تو کمرے میں بستر پر حارث بھائی چھوٹی آپی پر جھکے ہوئے تھے ۔ آہٹ پاکر انھوں نے اپنے کو چھوٹی آپی کے لحاف میں چھپا لیا ۔

رانی ایسا خون تھوک کر لوٹ رہی تھی تو وہ بے حد نڈھال تھی ۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ پھر اسی کمرے سے ہو کر گزرنے کے لیے مجبور تھی ۔ ہانپتے ہوئے جب وہ اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچی تو رک کر اس نے لحاف کی طرف نظر اٹھائی لیکن اس کی نظر لحاف سے ہٹ کر لاڈلی پر ٹھہر گئی جو لحاف کے برابر ہی بے سدھ سو رہی تھی ۔ اس نے لاڈلی کو اس طرح دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں آخری

بار چوم رہی ہو اور سنبھلتی ہوئی اپنے پلنگ تک پہنچ کر پڑ رہی۔

صبح چھوٹی آپی جب رانی اپیا کے برتنوں میں جو الگ رکھے جاتے تھے کچھ تلاش کرنے آئی تو رانی اپیا نے بہت غور سے اس کی آنکھوں میں پھیلا پھیلا کاجل دیکھا جو کہیں کہیں گالوں پر بھی نمایاں تھا۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو"؟ — رانی اپیا نے کچھ اس طرح سے پوچھا جیسے اُن کی اپنی کوئی چیز کھو گئی ہے اور چھوٹی آپی کھوج کو سمجھا لینا چاہتی ہے۔

"گلاس ڈھونڈ رہی ہوں اپیا — بہت پیاس لگی ہے"

رانی اپیا کی وہ آنکھیں جو بس اب سوجانے والی تھیں، اس طرح جاگ اٹھیں جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیدار ہو گئی ہوں۔

کچھ سوچ کر انھوں نے برابر کی تپائی پر رکھے ہوئے گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ دھرا ہے۔ پی لو!" چھوٹی آپی نے لمحہ بھر کے تذبذب کے بعد ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا اور ہونٹوں سے لگا رہی تھی کہ آواز آئی "خالہ امی۔ خالہ امی، تم کہاں ہو؟" بدن کی ساری قوت سمیٹ کر رانی اپیا اپنے بستر سے اچھل پڑیں — دیوانوں کی طرح انھوں نے ہاتھ مار کر پانی کا گلاس گرا دیا جو چھوٹی آپی کے ہونٹوں تک پہنچ چکا تھا "یہ مت پیو — مت پیو — یہ میرا جھوٹا ہے۔"

گلاس چھوٹی آپی کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹا نہیں۔ وہ رانی اپیا کے پلنگ پر گر پڑا تھا۔ اور پانی بستر اور فرش پر پھیل کر جذب ہو رہا تھا۔ پیاسی چھوٹی آپا دیدے پھاڑ کر رانی اپیا کو تک رہی تھی جو ہانپتی ہوئی نڈھال

ہو کر اپنے تکیے پر گر پڑی تھیں ۔

"جاؤ" ــــ مری ہوئی آواز میں رانی ایپا نے کہا ــ "منھ ہاتھ دھو لو ۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی ۔ نہ کنگھی نہ چوٹی ۔ نہ اُبٹن نہ غازہ ۔ عارش اور لاڈلی ناشتے پر تمھارے منتظر ہوں گے ۔ اتنی دیر کے جاگتی ہو ۔"

کھنڈر

میں نے ایک گلستاں کو ویرانے میں تبدیل ہوتا ہوا اس طرح دیکھ لیا۔ جیسے کہیں کچھ ہوا ہی نہیں۔ بعض حادثے، بعض سانحے بچی کھچی زندگی کا رُخ، موڑ دیتے ہیں۔ خود میں نے بھی اپنی چمن درچمن زندگی کے سب سے بڑے شاداب اور بار آور پھول کو ایک لمحہ بھر میں زندگی کی ہری شاخ سے ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے ہمدردی کے دو لفظ کسی سے نہیں مانگے۔ اپنی چپ پر بھی اگر یہ گمان ہوا ہے کہ کوئی اس چپ کے سہارے میرے دل کی آواز تک پہنچ رہا ہے تو میں نے باتیں کی ہیں، ایسی باتیں جن میں دور دور تک کسی غم کا شائبہ نہ ہو۔ اور تنہائی کا ہر لمحہ میں نے اسی انجمنِ ناز میں گزارا ہے، جس انجمن کو اس جیتی جاگتی دنیا سے اٹھا کر میں نے اپنے تاریک سینے میں چھپا لیا ہے اور میں زندہ ہوں، بڑے

ٹھاٹھ سے، بڑے ٹھسّے سے۔ کس میں ہمّت ہے جو یہ کہہ سکے کہ یہ آنکھیں جو اب بھیگی ہوئی ہیں۔ ان میں آنسو امڈ آئے ہیں ۔ کوئی ان آنسوؤں تک پہنچ رہا ہوتا ہے تو میں اپنا جلتا ہوا سگریٹ بڑی بے نیازی سے دور پھینکتا ہوں کہ کمبخت سارا دھواں ہیں آنکھوں ہی میں گھس آیا۔ لیکن کوئی کب تک اس دردناک جھوٹ کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اب مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

بات میں نے شروع کرنی چاہی تھی ایک پاگل سے، ایک دیوانے سے، ایک مجذوب سے، جو زمانۂ طالب علمی میں میرا ہم جماعت تھا۔ لیکن بات میں نے کی، اس باہوش دیوانے کی، جو اس پاگل کو اس عالم بے بسی میں دیکھ کر افسردہ وغمزدہ ہو جاتا ہے۔

وہ یکایک مجھ سے سڑک پر ملا۔ برسوں کے بعد۔ مدّتوں کے بعد۔

" اے ۔ مجھے دو آنے دے دے "

اور میں اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

" نواب شرافت اللہ خاں "

" حاضر جناب "

ادارہ علوم شرقیہ میں اردو کے استاد صاحب حاضری لینے کے لیے اس کا نام پُکارتے تو اس کو خوش کرنے کے لیے نواب، بطور خاص اس کے نام کے ساتھ لگا دیتے۔ اور وہ ان کی ضرورتوں کا کفیل ہوتا۔

" ایک روز شرافت نے بڑی لجاجت سے کہا تھا "

"آپ صرف میرا نام پکارا کیجئے —— نواب کہنے سے مجھے خوشی نہیں ہوتی اور نہ میں اس کو باعثِ توقیر سمجھتا ہوں۔"

پھر وہ حاضری کے وقت شرافت اللہ خاں پکارا جانے لگا لیکن اڈہ کے مولوی صاحب کی ضرورتوں کی کفالت بدستور اس کے ذمہ رہی۔

آج یہ دیوانہ میرے مقابل کھڑا مجھ سے دو آنے مانگ رہا تھا تو میں برسوں پیچھے لوٹ کر نواب شرافت اللہ خاں سے ادارہ علوم شرقیہ میں مل رہا تھا۔

اس کے چہرے کی شگفتگی بے شمار لکیروں کے پیچھے اس طرح چھپ گئی تھی جیسے کوئی نغمہ ریکارڈ کی لکیروں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔

"دے رے دو آنے۔ دیتا ہے کہ جاؤں۔"

میں نے اس کو کریدنا چاہا۔

"تم شرافت اللہ خاں ہو؟"

"ہاں، ہوں۔ اب دے بھی دے دو آنے۔"

"کیا کرو گے؟"

"چائے پیوں گا رے۔"

"مجھے پہچانتے ہو؟"

"نہیں رے۔"

اور اس نے اپنے دائیں، بائیں دیکھ کر سڑک پر اس طرح تھوک دیا۔ جیسے ساری دنیا کے منھ پر تھوک رہا ہو۔ پھر وہ متواتر تھوکتا رہا۔ خود اپنے کپڑوں پر بھی اس نے تھوک لیا تھا۔ اس کے جسم سے بدبو آرہی تھی۔ اس کی

کثافت اور گندگی نے مجھ میں کراہت کا احساس پیدا کیا اور میں نے جیب سے دو آنے نکال کر اس کو دے دیے۔ کچھ کہے بغیر وہ ادبیا کیفے کی طرف چلا گیا اور میں نے بھی اپنی راہ لی۔

بس اسٹینڈ تک پہنچتے پہنچتے شرافت اللہ خاں میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا اور میں بس کے منتظر مسافروں کے بیچ میں اپنے لیے جگہ بنا رہا تھا۔

دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ وہ پھر مجھ سے ملا۔

" ارے۔ دو آنے دے رے "

میں نے ٹال جانا چاہا۔ میری جیب خالی تھی۔ بس کے کرائے کے لیے آفس تک پہنچنے کو صرف ایک آنا تھا۔

" نہیں ہیں یار، ورنہ ضرور دے دیتا۔"

" جو کچھ ہے دے دے رے "

" نہیں، اس وقت نہیں، کل "

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کتنی ویران تھیں اس کی آنکھیں اتنی کہ آپ سچ پوچھیے تو ان آنکھوں کو دیکھ کر صرف ویرانے کا تصور بھی ذہن میں نہیں ابھرتا بلکہ کچھ ایسا احساس ہوتا تھا جیسے کسی ویرانے میں بدروحیں انسان کی تباہی کے لیے سرگوشیاں کر رہی ہوں۔

میں نے قدم بڑھائے تو وہ بھی پیچھے ہو لیا۔

" لا ـــ سگریٹ دئے جا "

میں نے دو چار سگریٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"کہاں رہتے ہو آج کل؟" میں نے پوچھا۔
"یہیں" اس نے شاہ صاحب کے تکیے کی طرف انگلی اٹھا دی۔
"اچھا۔ تب ہی تو اسی گلی میں نظر آتے ہو"
"ہندوستان پھر پھر چکا ہوں رے۔ دلّی اجاڑ دی۔ تاج محل برباد کر دیا۔ بہت بُرا کیا رے۔ بڑا بدنصیب ہوں"
"اجاڑ دی دلّی"
"ہاں"
"کیوں بھلا"
"بس پھونک دیا آگ لگ گئی"
"اچھا یہ بات ہے۔ اور تاج محل؟"
"تاج محل پونہ میں مل گیا۔ وہاں کے پتھر اکھاڑ لایا رے۔ تاج محل میں بڑا اندھیرا ہے۔ تو بھی قبر کے عذاب سے ڈرتا ہے نا ہے"
میں نے اس کی اوٹ پٹانگ باتوں پر مسکرانے کی کوشش کی پر اور بات ہے کہ مسکرا نہ سکا۔
میں آگے بڑھ گیا تو وہ شاہ صاحب کے تکیے پر سایہ کیے ہوئے گھنے پیپل کے نیچے جا بیٹھا۔
اب میں جب کبھی ادھر سے گزرتا، شاہ صاحب کے تکیے کی جانب غیر ارادی طور پر میری نظریں اٹھ جاتیں۔ وہ اکثر آنکھیں بند کیے ہوئے بیٹھا کچھ بڑبڑاتا رہتا اور بار بار اپنے اطراف تھوکتا رہتا۔ میں بھی دبے پاؤں گزر جانے

ہی میں اپنی عافیت سمجھتا۔

ایک روز اس نے مجھے للکارا۔

"چوروں کی طرح بھاگ رہا ہے رے"

واقعی جیسے میں چوری کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔

"بھاگ کہاں رہا ہوں۔ میں تو یہ سوچ کر اس لیے گزر رہا تھا کہ تم میاں کے دھیان میں ہو" وہ اللہ میاں کو بڑے پیار سے میاں کہا کرتا تھا۔

"دیکھ میاں نے بھیج دیا نا تجھے۔ لا پلا دے چائے"

میں نے سوچا۔ آج جی بھر کر اس کو تنگ کروں گا۔ اس کی پچھلی زندگی یاد دلاؤں گا۔ دیکھوں گا کہ وہ اپنے ماضی کے کھنڈر سے کچھ ساتھ بھی لے آیا ہے یا سب کا سب چھوڑ آیا ہے۔

"دیکھو میں تمہیں چائے بھی پلاؤں گا۔ کھانا بھی کھلاؤں گا لیکن تم مجھے پہچانو کہ میں کون ہوں"

"چل تو کیا کھانا کھلائے گا مجھے۔ کھانا تو میاں کھلاتا ہے"

"تو پھر چائے بھی میاں ہی سے پی لو"

اس نے دو چار بار زمین پر تھوک دیا۔ میں نے اس مکروہ خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا کہ وہ میرے منہ پر تھوک رہا ہے۔ پھر یکایک وہ تکیے کی طرف جانے لگا۔

میں نے کہا "سنو تو"

"جا نہیں سنتا"

"تم اتنی جلدی خفا کیوں ہو جاتے ہو؟"

" نہیں رے میں کسی سے خفا نہیں ہوتا۔ خفا تو صرف میاں سے ہوتا ہوں۔ وہ قبر کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ تو میں خفا ہو جاتا ہوں۔ ہی ہی ہی۔ سی سی سی ـــ" دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں دبائے وہ سرتا قدم کانپنے لگا۔ ایسے جیسے شدید ٹھنڈ محسوس رہا ہو۔

" یہ کیا ہو رہا ہے ہتھیں ؟"

لیکن وہ یہاں ہو تو میری آواز بھی سُنے۔ میں کھڑا کھڑا پتہ نہیں کہاں جا پہنچا تھا۔

میں نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک راہ گیر سے ملتجیانہ انداز سے کہا کہ سامنے والے ہوٹل سے وہ ایک پیالی چائے بھجوا دے۔ چائے آئی تو شرافت اللہ خاں کو میں نے بلند آواز سے پکارا جیسے فاصلے سے پکار رہا ہوں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں تو میں نے چائے بڑھا کر کہا پی لو۔

اس نے گرم گرم چائے منٹ بھر میں خالی کر کے کپ مجھے لوٹا دیا تو میں نے سگریٹ پیش کیا۔

سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

" تو کون ہے رے ؟"

میں نے موقع کو غنیمت جانا۔

" ادارۂ علوم شرقیہ یاد ہے تمہیں ؟"

ایک چمک سی اس کی آنکھوں میں اس طرح لہرائی جیسے گھُپ اندھیرے میں جگنو چمک اٹھا ہو۔ جگنو کی اس چمک میں مجھے امید کی کرن نظر آئی اور

میں اس کے ماضی کے کھنڈر میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا۔" وہاں ادارۂ علوم شرقیہ میں تمہارے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک بار تم مجھ سے جھگڑ بیٹھے تھے۔ وہ مولوی صاحب تھے نا، ان کا اچھا سا نام تھا کچھ ـــ جو تمہیں نواب پکارتے تھے اور جنھوں نے سنا ہے کہ خودکشی کر لی۔ اور وہ ـــ وہ لڑکی، کیا نام تھا اس کا ـــ وہی یار سیاہ برقعے والی "!

میری باتیں سنتا ہوا وہ ٹکٹکی باندھے فضاؤں میں کچھ اس طرح گھورتا رہا جیسے میرا ہاتھ تھامے خود بھی اپنے ماضی کے کھنڈر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر یکایک جیسے کسی چیز سے ڈر کر وہ یکلخت واپس بھاگ آیا۔

" جا تو بھی مر جا "سی سی سی اور اس پر وہی سردی میں کپکپانے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

" قبر کے عذاب سے تو بھی ڈرتا ہے نا؟"

اور میں نے اس جیتی جاگتی قبر کو شاہ صاحب کے تکیے پر چھوڑ کر آگے بڑھ جانا ہی مناسب سمجھا کیونکہ مجھے اس کی زندگی کے عذاب سے وحشت ہو رہی تھی۔

دبھی، دبھی کپڑوں میں ملبوس، اپنے تار تار دامن کے ساتھ وہ قریب قریب روز ہی مجھے نظر آتا۔ کبھی اس کی نظر مجھ پر نہ پڑتی تو میں چپکے سے نکل جاتا۔ کبھی وہ مجھے دیکھ لیتا تو خود مجھ اس عالم میں ہوتا کہ خالی خالی نظروں سے صرف مجھے دیکھتا رہ جاتا، کبھی ہوش و حواس بجا ہوتے تو تیز تیز مجھ تک آ پہنچتا یا کبھی پکار کر روک لیتا۔

"نواب ۔ نواب ۔ نواب ۔ چائے پلا دے رے ۔ آج تو سگریٹ بھی نہیں ہیں رے"۔

چائے کے لیے پیسے دے کر میں اسے سگریٹ کا پیکٹ پاس کی دکان سے دلا دیتا جہاں میرا اکاؤنٹ تھا۔

ایک شام میں نے لق و دق ریگزار میں موج در موج آبِ رواں دیکھ لیا۔

ایک شام میں نے چٹانوں کے سینے میں کچی کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھ لیا۔

ایک شام میں نے الٹے ہوئے کفن میں زندگی کو کسمساتے ہوئے دیکھ لیا۔

ایک شام میں نے دیکھا کہ شرافت اللہ خاں صاف ستھری شیروانی، مخمل کی دوپلی اوڑھے بڑے اطمینان اور تمکنت سے سڑک پر کہیں جا رہا ہے۔ اس وقت میں ایک بسکٹ کی دکان پر کھڑا اپنے دو سالہ بچہ کی فرمائش پوری کر رہا تھا۔ میں نے شرافت اللہ خاں کا بچھا دیکھا تھا۔ اس یقین کے باوجود کہ وہ وہی ہوگا، میرا دل اس کھلی حقیقت کو مان لینے سے منکر تھا۔ اگر وہ یکایک میرے سامنے آجاتا اور مجھ سے ملنے کے لیے پہل کرتا تو میں اسے پہچاننے سے شاید انکار کر دیتا۔

میں لق و دق ریگزار میں موج در موج آبِ رواں کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔

میں چٹان کے سینے میں کچی کلیوں کو کھلتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔

میں ہاتھ کو سجھائی نہ دینے والے اندھیرے میں کرنوں کا رقص کس طرح

دیکھ سکتا ہوں کہ اندھیرا برقرار بھی رہے ۔
میں لٹے ہوئے کفن میں زندگی کو کسماتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتا ہوں ۔
اگر یہ سب کچھ ممکن نہیں ہے تو شرافت اللہ خاں کا یہ روپ کس طرح ممکن ہوگا ۔
لیکن میں چٹکی ہوئی دھوپ سے کیسے انکار کر دوں ۔ شاہ صاحب کے تکیے پر شرافت اللہ خاں مجھے پھر کبھی نظر نہ آیا تو میں نے قرب وجوار کے لوگوں سے دریافت کیا ۔ سبھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا ۔ کسی نے قیاس آرائی کی کہ کسی دوسری درگاہ یا تکیے پر جا بسا ہوگا ۔ لیکن ایک دن بس اسٹینڈ پر شرافت اللہ خاں مجمع میں سے نکل آیا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا ۔
" دیکھو میں تیری دعا سے بالکل اچھا ہو گیا ہوں ۔ تو میرا محسن ہے ۔ میں نے تجھے بہت تکلیف دی ہے "
" نہیں شرافت ایسا نہ کہو یار "
اس نے بڑی گرمجوشی سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے " چلو میرے ساتھ چائے پیو "
میں بھی خوشی خوشی اس کے ساتھ ہو لیا ۔
ہوٹل پہنچ کر اس نے بہت ساری چیزیں منگوا لیں ۔ نمکین میٹھے بسکٹ، پیسٹری ۔
میں نے کہا " کیا کرتے ہو ؟ "
اس نے کہا " کیوں کیا تمہاری شرافت اس قابل نہیں ہے ؟ "

اور اس نے اصرار کر کے مجھے کھلایا۔ بساط بھر تواضع کی۔
میں نے کہا "سب کھالیں گے بھئی۔ پہلے جی بھر کے باتیں تو کرلیں۔
"دونوں جاری رکھیں۔ باتیں بھی یہ بھی" اس نے خود پہل کی۔
میں نے پوچھا "تم نے اب بھی مجھے پہچانا یا نہیں"
"ارے کمال کرتے ہو یار ـــ ہزار بار پہچان لیا ـــ تم شاعر دوست ہونا"
مجھے ادارۂ علوم شرقیہ کے اپنے ساتھیوں کا یہ اندازِ تخاطب فوراً یاد آگیا جس کو میں بھولا ہوا تھا۔
"ہاں بالکل شاعر دوست ہوں"
"پھر کیا حال ہے شاعری کا؟"
"چھوڑ دی"
"کیوں؟"
"بس نہیں چلا ٹٹو"
"نہیں جی، تمہاری ادارے بھر میں دھوم تھی۔ پھر شہر بھر میں لوگ تمہیں جاننے لگے تھے"
"بد مذاق ہو گئے تھے لوگ"
"بھئی کمال کرتے ہو ـ اب کیا کرتے ہو؟"
"نوکری"
"بچے کتنے ہیں؟"

"ساڑھے تین"

"سمجھا ـــــ یعنی بھائی حاملہ"

"جی ـــــ آداب عرض۔"

"لونا" اس نے بیڑی بڑھائی۔

"بہت لے چکا ـــــ کچھ اپنی بھی تو سناؤ"

"کیا سناؤں ـــــ بہت دکھ اٹھائے ہیں یار اس زندگی میں ہنستے نہیں کب تک پاگل رہتا۔ آج وہ دیوانگی کی زندگی یاد کرتا ہوں تو کچھ بکھرے خواب تو نظر آتے ہیں لیکن صاف صاف کچھ سجھائی نہیں دیتا اتنا تو یاد ہے کہ تم سے ملتا رہا ہوں۔ تمہیں تنگ کرتا رہا ہوں۔ تم سے پیسے مانگے ہیں۔ لیکن تمہیں اس زمانے میں کیا سمجھتا رہا ہوں"

"نہیں تو ـــــ بتاؤ آخر ـــــ"

"وہ جو اپنے ادارے میں اردو کے استاد تھے۔ علی زور وہی میرے دماغ پر چھائے رہتے تھے۔ جس کسی نے کبھی مجھ سے کچھ سلوک کیا میں انھیں علی زور سمجھ لیتا تھا۔ اس کی وجہ میں کچھ بھی نہیں جانتا"

میں نے بیچ ہی میں پوچھا۔

"حالانکہ تم ہی ان کے ہر طرح کفیل تھے ـــــ تم سے بھلا وہ کیا سلوک کر سکتے تھے ـــــ"

"انھوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اس داستان میں جواب میں تمہیں سناؤں گا ان کے ارادے کا کہاں تک دخل تھا اور میری بدنصیبی کہاں تک

شامل تھی اس کا صحیح اندازہ تم کر سکو تو کرو۔ میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وقت آدمی کو ایسے زخم دے کر گزر جاتا ہے کہ ان کا اندمال وقت کے بس کی بات بھی نہیں رہتی۔ اور یوں بھی یہ کیا ضروری ہے کہ کسی کا لگایا ہوا زخم اسی کے لگائے ہوئے مرہم سے مندمل بھی ہو جائے۔ علی نذر جب اپنی ایمانداری اور طویل ملازمت کی بنیاد پر ادارے کے خازن بھی بنا دیے گئے تو انھوں نے معلوم نہیں کب سے ادارے کی رقم اپنے تصرّف میں لانی شروع کر دی تھی۔ جب یہ راز فاش ہوا تو وہ روپوش ہو گئے۔

"ایک رات جبکہ میں اپنے دیوان خانے میں بیٹھا ہوا نعیمہ کو خط لکھ رہا تھا۔ مجھے دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے کچھ دیر اس چاپ کو بہ غور سننے کی کوشش کی لیکن پھر کوئی آہٹ نہ ہوئی تو اسے واہمے پر محمول کر کے میں پھر خط لکھنے میں محو ہو گیا۔

"تمھیں نعیمہ تو یاد ہو گی۔ وہی نعیمہ جو اپنے ادارے کی لڑکیوں میں ستاروں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے چاند کی تمثیل سمجھی جاتی تھی۔

"وہی نعیمہ جس کے نشے میں ان دنوں میں چور تھا۔ وہی نعیمہ میرے دل جس کے نام سے منسوب تھے اور میری راتیں جس کے نام سے مشہور۔

"وہی نعیمہ جس کے لیے ادارے کے لڑکے کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی نوٹ بک پر صرف شرافت اللہ خاں کا نام لکھنا جانتی ہے۔

"ہماری ایک دوسرے کے لیے دیوانگی کی حد تک نیک دلی رسوائی کا باعث بننے کی بجائے نیک تمنّاؤں کا اظہار بن گئی تھی اس لیے کہ نعیمہ مجھ سے

منسوب کر دی گئی تھی اور کچھ ہی دن میں اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا جانے والا تھا ــــ یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ تم ادارہ چھوڑ چکے تھے۔"

وہ بڑے اطمینان سے اپنی داستان سُنا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دُور دُور تک کسی کرب یا درد کی پرچھائیاں نہیں تھیں۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔ لیکن سناتے سناتے وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ پھر خود ہی چونک کر جیسے ماضی کے اس کھنڈر سے واپس لوٹ آیا۔ جس کھنڈر میں کبھی میرے سہارے وہ داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن آج بڑے اطمینان سے کسی کی مدد کے بغیر ان کھنڈروں میں گھوم پھر سکتا تھا۔

سگریٹ سلگا کر کش لیے بغیر ہی وہ کہنے لگا۔

"اگر تمہیں یہ بھی بتاتا چلوں کہ نعیمہ کے حصول کے لیے مجھے کن آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے تو داستان طویل ہو جائے گی۔ صرف اتنا جان لو کہ جہاں ایک نظر میں زندگی کی ساری پونجی" ایک ایک سانس، دولت میں نے نعیمہ کے قدموں میں رکھ دی وہیں نعیمہ نے جھک کر سب کچھ بڑے چاؤ سے اٹھا لیا اور اپنے سینے میں چھپا لیا۔ تم دیکھو کہ دل کے اس معاملہ میں بیک وقت میری طرح خوش نصیب اور بدنصیب کوئی ہو بھی سکتا ہے۔ بات میں نے آگے بڑھائی تو میرے گھر والوں نے بخوشی منظور کر لی۔ پیام بھیجا گیا تو نعیمہ کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔ بس اس طرح جیسے کسی ننھے نے چاند پر للچا کر ہاتھ بڑھایا تو چاند اس کے قبضے میں تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہوئی اور میں دن گننے لگا۔ ایک ایک منٹ ایک ایک دن اور ایک ایک دن ایک ایک برس لگتا تھا۔ میں یہ سوچ کر ہی تڑپ اٹھتا

تھاکہ وہ لوگ ہجر کی لمبی راتوں کو اپنا مقدر بنتا ہوا دیکھتے ہوں گے۔ وہ کس طرح زندہ رہ پاتے ہوں گے۔ وہ ساعت قریب تر ہو رہی تھی جو میرے لیے زندگی سب سے بڑی نعمت بننے والی تھی۔ اس اثنا میں نعیمہ کو میں نے محبت کے خطوط لکھے تھے اور اس کی جانب سے محبت کے جواب پائے تھے۔ ہم نے نامۂ پیام کی اس مختصر سی مدّت میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کا سب کچھ مان لیا تھا۔"

وہ پھر کچھ خاموش ہوا۔ سگریٹ کا گُل جھاڑ کر اس نے کش لیا اور دھواں چھت کی طرف چھوڑ کر کہنے لگا۔

"نعیمہ نے مجھے ایک خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ اس نے ہمارے ایک دوسرے سے منسوب ہونے کے فوراً بعد ہی مجھے لکھا تھا کہ اپنے خاندان کے ایک لڑکے سے وہ بچپن ہی سے منسوب تھی لیکن اس کے چال چلن، اس کی آوارگی اور جہالت کے باعث نعیمہ کے والدین نے انھیں ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے خاندان میں بڑی کشیدگی پیدا ہوگئی تھی اور عاشق نامراد، میری مراد میرے رقیب سے ہے، میری جان کا درپے تھا۔۔۔ خیر وہ میری جان تو کیا لیتا، خوف وہراس پیدا کر کے اس نے میرے گھر والوں کو دہشت زدہ ضرور کر دیا تھا۔ ایک بار مجھ پر حملہ کیا بھی تو اس کے دل کی دل ہی میں رہ گئی لیکن اس وقت میں ذرا محتاط ہو گیا تھا۔ ادھر نعیمہ کا یہ عالم تھا کہ ہر خط میں مجھے ہوشیار رہنے کے لیے لکھتی اور میری سلامتی کی دعائیں مانگتی۔

اس رات جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں دیوان خانے میں بیٹھا نعیم کو خط لکھ رہا تھا کہ میرے دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قدموں کی یہ چاپ بڑے ڈرامائی انداز سے آ رہی تھی۔ کوئی تیز تیز برآمدے میں چلتا۔ دروازے میں چونکہ پالش کیے ہوئے پتھروں کا فرش تھا اس لیے بہت نمایاں طور پر اس سناٹے میں کانوں کے پردوں پر یہ چاپ اپنا تاثر چھوڑ رہی تھی۔ عام حالات میں شاید اس کو اتنی اہمیت نہ دیتا۔ میں خود چونکہ پہلے ہی سے محتاط تھا، اس لیے خوف ہراس کی اس بوجھل فضا میں ایک وحشت سی مجھ پر مسلط ہو گئی تھی۔ وہ شخص جو باہر ٹہل رہا تھا اس کے ایک ایک قدم کی چاپ اس کے اٹل ارادے کا پتہ دے رہی تھی وہ ٹہلتا ٹہلتا اس طرح رک جاتا جیسے رات کے سناٹے کو شدت سے محسوس کروانے کا بطور خاص اہتمام کر رہا ہو۔ واقعی وہ چپ ہو جاتا تو میں فرش پر سوئی گرا کر اس کی آواز تک سن سکتا تھا۔ پھر یکایک وہ اسی تیزی سے فرش پر چلتا جیسے کسی کو دبوچ رہا ہو، کسی پر حملہ کر رہا ہو۔ میں حیران اس بات پر بھی تھا کہ وہ میرے برآمدے تک کس طرح پہنچ سکا ہے اور پھر اس طرح ٹہلتے رہنے سے اس کا کیا مقصد ہے۔ نہ وہ دروازہ ہی کھٹکھٹاتا ہے۔ نہ مجھے پکارتا ہے۔ میں نے آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا — کون ہو۔؟"

کوئی جواب نہ ملا۔

"کون ہو — بتاتے ہو کہ گولی چلا دوں — میں تمہیں دکھائی نہیں دے

رہا ہوں ـــــ لیکن تم مجھے صاف دکھائی دے رہے ہو۔"
"میں ہوں ـــــ علی زور ـــ"
میں نے آواز پہچانتے ہوئے بھی مزید اطمینان کر لینا چاہا۔
"کیا کہا ـــ کون ہو؟"
"میں علی زور ہوں شرافت ۔ دروازہ کھولو۔"
اس کے باوجود میں نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا وہ علی زور ہی تھے۔
انھوں نے مجھ سے پوچھا "تم میرے متعلق سب کچھ جانتے ہو نا"
ہاں میں نے کہا "اچھی طرح جانتا ہوں پولیس آپ کا پیچھا کر رہی ہے ـــ"
"پھر یہاں رات کے رات ٹھہرنے دو گے مجھے؟"
میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے پوچھا ۔ آپ اتنی دیر سے باہر کیوں ٹہلتے رہے ـــ
علی زور نے مجھے بتایا کہ وہ اس بات سے ڈر رہے تھے مبادا میرے بجائے میرے ابا سے ملاقات ہو جائے تو وہ کہیں انھیں پولیس کے حوالے نہ کر دیں اسی لیے ڈرامائی انداز سے انھوں نے قدموں کی چاپ سے کام لیا تاکہ میں خود ان سے کچھ پوچھوں اور وہ آواز پہچان سکیں۔
علی زور بے حد مطمئن تھے۔ کسی قسم کی پریشانی یا تفکر کے آثار ان کے چہرے پر قطعی نہ تھے سگریٹ جلایا اور کہنے لگے جاؤ اب آرام کرو رات

زیادہ ہو گئی ہے۔ مجھے پَو پھٹنے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے اپنی مذموم حرکت کی نسبت کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتے ہیں لیکن مجھے بُرا ایسا لگا کہ ان کے چہرے پر احساس شرم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ندامت کے کوئی آثار نہ تھے۔

میں نے اپنا بستر ان کے لیے چھوڑ دیا اور خود مکان کے اندرونی حصے میں چلا گیا اور نعیمہ کو لکھا جانے والا خط آج تک ادھورا ہے۔

پو پھٹی۔

صبح ہوئی۔

سورج نکلا۔

دن چڑھا۔

لیکن علی زور نے اندر سے دروازہ نہ کھولا۔ مجھے تشویش ہوئی میں نے صدر دروازے سے باہر کی جانب برآمدے میں جا کر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا اگر وہ گہری نیند سوئے ہوئے تھے اور اس شور پکار سے ابّا کو پتہ چل جاتا تو پھر میرے لیے ان کو چھپا کر فرار کروانا بھی مشکل تھا۔

میری تشویش جب بڑھی تو ابّا کو اطلاع کرنے اور دروازہ کو توڑ کر اندر داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

دروازہ توڑا گیا۔

علی زور نیچے فرش پر پڑے تھے ان کے ناک اور منہ سے خون بہہ کر خشک ہو گیا تھا۔ انھوں نے خودکشی کر لی تھی۔

میں ادارہ علوم شرقیہ کا طالب علم تھا۔ وہ استاد تھے۔ میرے گھر آتے جاتے تھے۔ ان کی تلاش میں پولیس نے پہلے ہی ہم سے بھی پوچھ تاچھ کی تھی۔ میں شبہ میں پکڑ لیا گیا۔ اور میرے دشمنوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور میرے رقیب نے کوئی دقیقہ میری بربادی کا اٹھا نہ رکھا۔

اس نے جلتے ہوئے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگایا اور خلاؤں میں گھورنے لگا مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شاہ صاحب کے تکیے پر بیٹھا اپنے اطراف خود کشی کا کام شروع کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔ لمحے بھر کے لیے اس کے چہرے پر وہ ساری کیفیتیں لہرا کے رہ گئیں جو زمانۂ دیوانگی میں اس کا حصہ تھیں۔

میں نے اس داستان کو آج کی حد تک یہیں ختم کر دینا چاہا ——— ——— لیکن میرے سامنے بیٹھا ہوا بھی وہ میرے پاس موجود نہیں تھا، کہیں دور دور بھٹک رہا تھا۔ پھر یکایک وہ کہنے لگا ——— زندگی ایک پل میں کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ انسان اتنا مجبور کیوں ہے۔ بعض وقت تو میاں پر ایمان اٹھ جاتا ہے۔ وہ بے گناہوں کو اتنی اذیت میں کس طرح دیکھ سکتے ہیں اور اگر تقدیر سب کچھ ہے تو کیا آدمی کچھ بھی نہیں ہے۔

میں نے گھسا پٹا وہی جملہ دہرا دیا ——— "اور اپنے چہیتوں ہی کو تو آزماتا ہے۔"

لیکن وہ میرے اس جملے کی پہنچ سے کہیں آگے نکل چکا تھا۔

میں نے موضوع بدل دینا چاہا۔

"تمہارے والدین کہاں ہیں؟"
"زمانہ ہوا یہاں سے چلے گئے"
"پھر تم یہاں"
"میں بھاگ آیا ہوں ___ میں کہاں جاسکتا ہوں۔ کہیں بھی تو نہیں جاسکتا۔ نعیمہ جو یہاں دفن ہے۔ اس کے والد نے اس حادثے کے بعد جب مجھے سزا ہو گئی تو اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیا۔ نعیمہ نے خودکشی کر لی ___ نعیمہ ___ اور قبر کی تاریکی ___ اس کا عذاب۔ اُف"
"چلو چلیں ___ یہاں سے ___ مجھے بڑی وحشت سی ہو رہی ہے"
وہ یکایک اٹھا۔ جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس نے بل ادا کیا۔ کاؤنٹر سے دو روپے اور کچھ ریزگاری لے کر تیزی سے سڑک پر پہنچ گیا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا تو سیمنٹ کی سڑک پر میرے جوتوں کی کھٹ کھٹ نے علی زور کے قدموں کی اس چاپ کی یاد دلائی جس کی تفصیل ابھی ابھی شرافت نے بیان کی تھی ___

میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے رک کر بڑے غور سے میرے قدموں کی چاپ سُنی۔

میں نے اس کو دیکھا تو وہ شرافت اللہ خاں کہیں نہیں تھا۔ جس کے ساتھ اتنا وقت میں نے ابھی ابھی کیفے میں گزارا تھا۔
میرے سامنے تو وہی دیوانہ، وہی پاگل کھڑا ہوا تھا جسے لوگ مجذوب سمجھتے اور جس کے مجذوب درود کی باتیں کرتے تھے ..... دیکھئے ... دیکھئے ...

..... لباس اور تار تار دامن میں جو قریب روز ہی مجھے شاہ صاحب کے بنگلے پر ملتا تھا اور جو میرے قدموں کی چاپ سے کبھی کبھی چونک جاتا تھا۔

اب جو دیوانہ میرے سامنے کھڑا تھا اس نے البتہ ڈھنگ کی شیروانی پہن رکھی تھی اور مخملی دوپلی اوڑھے ہوئے تھا۔

"دو آنے دے رے ـــــ صبح سے چائے نہیں پی ہے رے"

اس نے اپنے اطراف تھوکتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے آگے پھیلا دیا۔

میں بالکل بے بس تھا۔ میں اُسے تکے جا رہا تھا۔

"دیتا ہے کہ جاؤں ـــ دے رے"

میں نے دو آنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ شرافت اللہ خاں کی جیب میں دو روپے ہیں لیکن اس دیوانے کو شرافت اللہ خاں سے کیا لینا ـــــ

وہ دو آنے لے کر تیز تیز چلتا ہوا پھر اولمپیا کیفے میں گھس آیا ـــــ اور میں آج پھر ایک گلستاں کو ویرانے میں تبدیل ہوتا ہوا اس طرح دیکھتا رہا جیسے کہیں کچھ ہوا ہی نہیں۔

آرزوؤں کے ایک شہر کو محرومیوں کا کھنڈر بنتا ہوا اس طرح دیکھتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔